

5 فروری
یوم یکجہتی کشمیر

تعلیم و تربیت

فروری 2014ء

کشمیر
بے گناہ پاکستان



پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

فروری 2014ء

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی

73 واں سال دسواں شمارہ

اس شمارے میں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک شہزادہ شکار کھیل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک بوڑھا نیا باغ لگا رہا ہے۔ شہزادے نے اس سے پوچھا: ”تم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہو، پھر باغ لگانے کی زحمت کیوں اٹھاتے ہو؟“ بوڑھے نے جواب دیا: ”جناب عالی! اول تو موت کا کوئی وقت نہیں۔ آئے تو ابھی آجائے اور نہ آئے تو دس بیس برس بھی نہ آئے۔ باغ میرے سامنے پھل لے آیا تو میں بھی اس کی بہار دیکھ لوں گا اور اگر میں پہلے مر گیا تو جس طرح دوسروں کے لگائے ہوئے درختوں کے پھل ہم کھا رہے ہیں، ہمارے لگائے ہوئے درختوں کے دوسرے کھالیں گے۔“ شہزادے نے کہا: ”اتنی لمبی امید عقل کے خلاف ہے۔ خیر اگر تمہارے جیتے جی یہ پیڑ پھل دے گئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس باغ کا مالیہ معاف کرا دوں گا۔“

چند سال گزرے کہ بادشاہ فوت ہو گیا اور وہی شہزادہ تخت نشین ہوا تو اس نے ملک کا دورہ شروع کیا۔ اتفاق سے اسی باغ کی طرف آ نکلا۔ بوڑھے نے سلام دعا کے بعد اس سے عرض کی: ”حضور! جب میں باغ لگا رہا تھا، ایک بہت بڑے شہزادے نے میری ضعیفی دیکھ کر وعدہ فرمایا تھا کہ اگر تمہاری عمر میں یہ باغ پھل دے گیا تو ہم مالیہ معاف کرا دیں گے۔ اب باغ دو سال سے پھل دے رہا ہے۔ حضور بادشاہ ہیں، مگر سب شہزادوں کو پیغام پہنچا دیں تو ممکن ہے میرا کام ہو جائے۔“

یہ بات سن کر بادشاہ کو سارا واقعہ یاد آ گیا اور اسی وقت معافی کا فرمان عطا فرما کر کہا: ”باہمت بوڑھے! خوش ہو۔ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے تم سے وعدہ کیا تھا اور اب تمہاری ہمت کا پھل دینے کو خود موجود ہو گیا ہوں۔“

5 فروری کا دن ”یوم کشمیر“ کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کشمیر کی تحریک آزادی میں ہم ہر طرح سے اپنے مظلوم کشمیری بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ ان کی قربانیاں ہرگز رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ان شاء اللہ! ایک نہ ایک دن وہ آزادی کی منزل ضرور حاصل کر لیں گے۔ آئیے! ہم سب ان کے ساتھ اتحاد اور یک جہتی کا عہد کریں۔

نہے ساتھیو! ملک اس وقت نازک ترین حالات سے دوچار ہے۔ ہمیں یہ کامل یقین رکھنا ہو گا کہ ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں اور صرف پاکستانی..... اور بس۔ اسی فلسفہ حیات میں ہماری بقاء ہے۔ یہ مثبت سوچ ہمیں تمام تر تعصبات کو کچل کر آسمان پر ستاروں کی مانند جگمگانے میں مددگار ثابت ہوگی۔ اللہ کریم ہمارے وطن عزیز اور اس میں بسنے والے تمام پاکستانیوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ نہے ساتھیو! اپنا خیال رکھیں، خوب پڑھیں اور خوب محنت کریں۔ ہم سب کی امیدیں آپ بچوں ہی سے وابستہ ہیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اب آپ اپنا محبوب رسالہ پڑھنا شروع کریں اور اس کی ترقی کے لیے دعا گو رہیں۔ والسلام..... (ایڈیٹر)

1	اداریہ
2	حمد و نعت
3	درس قرآن و حدیث
4	عجیب امتحان
7	کشمیر کی کہانی
10	آئیے عہد کریں
11	پیارے اللہ کے
13	باباجی
15	سوال یہ ہے کہ
16	اوجھل خاکے
17	سائنس کا راز
18	کھیل دس منٹ کا
19	انتقام کی بار
22	صدیق ساکب
24	معلومات عامہ
25	میری زندگی کے مقاصد
26	آئیے مسکرائیے
27	بوجھ تو جائیں
28	محاورہ کہانی
29	بچوں کا انسائیکلو پیڈیا
31	دماغ لڑاؤ
32	ذائقہ کارز
33	علم، نماز (نظمیں)
34	دو دھاری تلوار
36	پیارا پیارا کشمیر (نظم)
37	کھوج لگائیے
38	مختصر مختصر
40	سننا ذرا سننے میاں!
43	سکھ کی کتنی
47	آپ بھی لکھیے
51	راجو
55	آپ کا خط ملا
57	نیم حکیم
59	ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ
62	دوستی
64	بلا عنوان

اور بہت سے دل چپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یوم یک جہتی کشمیر

سرکولیشن اسٹنٹ

مشیر

اسٹنٹ ایڈیٹر

ایڈیٹر، پبلشر

چیف ایڈیٹر

محمد بشیر راہی

سعید لخت

عابدہ اصغر

ظہیر سلام

عبد السلام

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 - ایپریل روڈ، لاہور۔

UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816

E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com

tot tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔

سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بٹک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت

میں سرکولیشن مینجر: ماہنامہ ”تعلیم و تربیت“ 32 - ایپریل روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔

فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 500 روپے۔

مشرق وسطی (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

ایشیاء، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2000 روپے۔

قیمت نی پرچہ:
25 روپے

فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی



فیروز سنز کی بچوں کی تعلیمی و معیاری کتب

دہائیوں سے قوم کے نونہالوں کی خدمت میں پیش پیش



زیر طبع

مشہور و معروف مصنفہ غزالہ سلیمی کے قلم سے

دل کش ٹائٹل، رنگین تصاویر، آسان، دل چسپ اور سبق آموز جنہیں آپ حُرے لے لے کر پڑھیں گے۔

پنجاب: 60۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔ 042-111-626262

ہدایات برائے آرڈرز

سندھ اور بلوچستان: پکلی منزل، مہران ہائیکس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔ 021-35867239-35830467

خمس: پختونخوا، اسلام آباد، آزاد کشمیر، قبائلی علاقے: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔ 051-5124970-5124879

حمد باری تعالیٰ

نہیں تاب حمد سرائی کی
نہیں حد تیری خدائی کی
ناچیز کو بھی چیز کرے
تیری شان کرم فرمائی کی
حق بندگی نہ ہوا ادا
مگر تو نے پذیرائی کی
جہاں درد لاعلاج ہو
وہاں تو نے مسیحا کی
ہو گیا دو جہانوں سے بے نیاز
مولا جس نے تیرے در کی گدائی کی
موت بھی اسے ڈرا نہ سکی
جس نے تجھ سے آشنائی کی
نادان ہیں وہ سبھی کہہ ہی دے تو نسیم
جس جس نے در غیر پہ کاسہ سرائی کی
ہاں محمدؐ سے اس کے بندوں کی محبت ہے اس کی رضا
شرک و بدعت نہیں حمت ہے جو حضورؐ سے مل شائستگی کی

نعت رسول مقبولؐ

ہر اک بے نوا کو سہارا ملے
ہر اک ڈوبتی کو کنازہ ملے
خوشی آئے میری بھی آنکھوں میں اس دم
جو روضے کا ان کے نظارا ملے
سبھی عاصیوں کی امیدیں لگی ہیں
شفاعت کی ان کا اشارہ ملے
گنہگار ہوں پر مقدر پہ مازاں
کہ نام امتیوں میں ہمارا ملے ان شاء اللہ
بلا لو مجھے اب تو اے کملی والے
مقدر کو میرے ستارہ ملے
میری جھولی خالی ہے سن لو صدائیں
کوئی اور بھی نہ دوارہ ملے
یہ وعدہ خدا کا ہے بندوں سے اپنے
محمدؐ سے ہی دین سارا ملے
نسیم ان کی سنت پر ہر اک چلے جو
جہاں میں نہ کوئی بے چارہ ملے

نسیم اختر نسیم

غصے کا طوفان

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جس کو غصہ آتا ہے وہ آگ بگولا ہو جاتا ہے۔ اس کا چہرہ آگ کی مانند تپنے لگتا ہے، اس کی آنکھیں آگ برساتی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ غصے کا یہ طوفان شیطان کی طرف سے برپا ہوتا ہے۔ شیطان ہمارے کان میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جن کی وجہ سے ہم غصے میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور اس کے اجزاء پر آگ غالب ہے اور جب آگ بھڑک اٹھے تو اس کو پانی سے بجھاتے اور ٹھنڈا کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر غصے کی آگ بھڑک اٹھے تو اسے وضو کے ذریعہ بجھا دینا چاہیے۔ اس لیے کہ وضو پانی سے ہوتا ہے اور پانی سے آگ ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح غصے کے اس طوفان کو قابو کرنے کا ایک اور طریقہ بتایا کہ جب غصہ آئے تو اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ پڑھ لے۔

(بخاری، کتاب الادب، باب الخذر من الغضب: 6115، مسلم، کتاب

البر والصلة والآداب: 2610)

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے بھی فرمایا ہے کہ:

اور اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو (فوراً) اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ (الاعراف: 200)

دیکھئے! شیطان ہمیں غصے میں مبتلا کر کے نقصان پہنچانا چاہتا ہے لیکن اگر ہم شیطان کی بجائے رحمان کے بندے بن جائیں اور اللہ تعالیٰ یا اس کے حبیب کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کر لیں تو شیطان کی کمر ٹوٹ جاتی ہے اور وہ اپنا سامنہ لے کر رہ جاتا ہے کیوں کہ اس کے ارادوں پر عمل کرتے تو ہمارا نقصان تھا اور ہم نے غصے کو قابو کیا تو اس نقصان سے بچ گئے۔

پیارے بچو! شیطان کے ارادوں سے ہوشیار رہیں اور اگر وہ آپ کو غصے میں مبتلا کر ہی دے تو زبان سے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ پڑھ لیں اور وضو کر لیں، ان شاء اللہ غصے کا یہ طوفان قابو میں آجائے گا۔

آپ نے شہد تو کھایا ہوگا، شہد کس قدر میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔ اگر شہد کا ایک چمچ منہ میں ڈال لیا جائے تو طبیعت کو فرحت اور سرور حاصل ہو جاتا ہے لیکن اگر اسی شہد میں نیم یا کریلے کا کچھ پانی ملا دیا جائے جو کہ انتہائی کڑوا ہوتا ہے تو یہی شہد انتہائی تلخ ہو جاتا ہے اور حلق سے نیچے نہیں اترتا، طبیعت اس کے کھانے پر آمادہ نہیں ہوتی اور شہد خراب ہو جاتا ہے۔

اس مثال کو سامنے رکھیے اور پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو پڑھیے:

”غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر دیتا ہے جس طرح ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔“ (شعب الایمان، کتاب حسن الخلق: 7941)

اس حدیث میں ناجائز غصہ کی بُرائی بیان فرمائی ہے کہ اس کی وجہ سے ایمان کی روشنی ناپید ہو جاتی ہے، ایمان کی ترقی میں کمی واقع ہو جاتی ہے، ایمان کی تازگی اور شادابی میں فرق آ جاتا ہے اور ایمان کامل نہیں ہو پاتا۔

جب غصے کا یہ طوفان برپا ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے بہت سے لڑائی جھگڑے واقع ہوتے ہیں۔ دوست دوست سے جدا ہو جاتے ہیں، محبت کرنے والوں کے دل نفرت کی آگ میں تپنے لگتے ہیں۔ گھر کے گھر اس کے آتش بگولوں کی زد میں آ جاتے ہیں، بستیوں کی بستیاں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات تو غصہ کا یہ طوفان دل سے ایمان کی شمع کو بجھا ڈالتا ہے۔

غصے کا یہ طوفان کیسے برپا ہوتا ہے اور ہم اس طوفان کو کیسے قابو کر سکتے ہیں؟ اس کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیں: غصہ شیطان کی طرف سے آتا ہے اور شیطان کو آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آگ کو پانی سے بجھا دیا جاتا ہے، اس لیے جب تم میں سے کوئی شخص غصہ ہو تو اس کو وضو کر لینا چاہیے۔

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب ما یقال عند الغضب: 4784)

عجیب امتحان



لیاقت علی

شہزادی کی بات سن کر سب حیران رہ گئے۔

”لڑکی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو..... تم ہوش میں تو ہو؟“ بادشاہ آگ بگولہ ہو کر بولا۔

”اباحضور! میں بقائگی ہوش و حواس میں یہ سب کچھ کہہ رہی ہوں..... میں شادی کے لیے آنے والے ہر نوجوان سے ایک امتحان لوں گی..... جو میرے امتحان میں پورا اترے گا میں صرف اس سے شادی کروں گی..... ورنہ میں ہرگز کسی سے شادی نہیں کروں گی۔“ شہزادی نے چٹانوں کی سی سختی سے کہا۔

یہ شہزادی ملک فارس کے بادشاہ جمال عبداللہ کی بیٹی نور جمال تھی۔ شہزادی نور جمال حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ذہین بھی تھی۔ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچی تو بادشاہ نے اس کی شادی کا ارادہ ظاہر کیا۔ شہزادی کو اس بات کا پتا چلا تو اس نے ایک عجیب و غریب شرط عائد کر دی اور کہا کہ وہ شادی کے لیے آنے والے ہر نوجوان کا امتحان لے گی۔ وہ ہر نوجوان سے تین سوال پوچھے گی۔ جو نوجوان اس کے سوالوں کا صحیح جواب دے گا وہ اس سے شادی کر لے گی۔ بادشاہ یہ سن کر بہت پریشان ہوا۔ اس نے

بیٹی کو بہت سمجھایا کہ وہ اپنی فضول ضد چھوڑ دے۔ اب ایسی باتوں کا زمانہ نہیں رہا مگر شہزادی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ آخر کار بادشاہ جمال عبداللہ نے شہزادی کی ضد سے مجبور ہو کر ملک بھر میں منادی کرادی کہ جو نوجوان شہزادی نور جمال کے تین سوالوں کے جواب دے گا اس کی شادی شہزادی سے کر دی جائے گی لیکن اگر وہ ناکام رہا تو سزا کے طور پر اسے جیل میں ڈال دیا جائے گا جہاں اسے اپنی بقیہ زندگی گزارنی ہوگی۔ اعلان سنتے ہی کئی نوجوان بادشاہ سلامت کے دربار میں پیش ہوئے جنہیں اپنے علم اور اپنی ذہانت پر ناز تھا لیکن شہزادی کے سوال سن کر وہ کوشش کے باوجود ان سوالوں کے جوابات نہیں ڈھونڈ پائے اور بالآخر انہیں جیل کی ہوا کھانا پڑی۔ تین چار ماہ گزر گئے۔ سینکڑوں نوجوان جیل میں پہنچ گئے۔ کوئی بھی شہزادی کے سوالوں کے جواب نہ دے سکا۔ وہ سوال تھے بھی بڑے عجیب و غریب۔ بادشاہ ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔ اس نے بیٹی کو سمجھانے کی ایک اور کوشش کی لیکن شہزادی نور جمال نے اپنی ضد نہیں چھوڑی۔ آخر کار تھک ہار کر بادشاہ خاموش ہو گیا۔ اب نوجوانوں نے آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

اسی ملک کے ایک دُور دراز کے سرحدی گاؤں میں ایک انتہائی غریب لڑکا رہتا تھا۔ اس کا نام سلیم تھا۔ وہ ایک غریب کسان کا بیٹا تھا۔ سلیم ایک نیک سیرت اور ہر کسی کے کام آنے والا نوجوان تھا۔ جب اس نے بادشاہ کا اعلان سنا تو اپنی قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا اور اللہ کا نام لے کر بادشاہ کے محل پہنچ گیا۔ بادشاہ کے محافظوں نے اسے بٹھایا اور بادشاہ کو اطلاع دی کہ ایک نوجوان شہزادی کے سوالات سننے کے لیے آیا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب دربار شروع ہوا تو بادشاہ نے شہزادی کو بلا کر کہا کہ وہ اس سے سوالات پوچھے۔ شہزادی نے اسے کہا:

”تم جانتے ہو کہ تمہیں میرے تین سوالوں کا جواب دینا ہے اور اگر تم جواب نہ دے پائے تو تمہیں اپنی باقی زندگی جیل میں گزارنی پڑے گی۔“

”جی شہزادی حضور! آپ اپنے سوال بتائیے۔“ سلیم نے نظریں جھکائے انتہائی ادب سے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ شہزادی نے کہا اور اسے اپنے سوال بتانے لگی۔
”پہلا سوال: وہ کون سا پانی ہے جو نہ آسمان سے برسا ہے اور نہ ہی زمین سے نکلا ہے؟“

دوسرا سوال: وہ کون سا پھل ہے جو میٹھا ہونے کے باوجود بازار میں نہیں بکتا؟

تیسرا سوال: وہ کون سی چیز ہے جس کے بغیر ایک بادشاہ مکمل نہیں ہوتا؟“

شہزادی کے سوال سن کر سلیم چکرا گیا، حالانکہ وہ بہت ذہین تھا۔ تاہم اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور بولا:

”مجھے کچھ دن کی مہلت دی جائے تاکہ میں ان سوالوں کے جواب معلوم کر سکوں۔“

”ٹھیک ہے تمہیں ایک ماہ کی مہلت دی جاتی ہے۔“ شہزادی کو یقین تھا کہ وہ ان سوالوں کے جواب معلوم نہیں کر سکے گا۔ اس لیے اس نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سلیم کو ایک ماہ کی مہلت دے دی۔ سلیم نے شہزادی کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت لے کر محل سے نکل آیا۔

☆☆☆

سلیم کو محل سے نکلے دسواں دن تھا۔ وہ ابھی تک شہزادی کے سوالوں کے جواب معلوم نہیں کر پایا تھا۔ وہ تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک سایہ دار جگہ تلاش کی اور وہاں کھانا کھانے کے لیے بیٹھ گیا۔

”اللہ کے نام پر بابا..... صبح سے بھوکا ہوں۔“ وہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھا ہی تھا کہ اسے ایک آواز سنائی دی۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک خستہ حال بوڑھا کھڑا اس سے روٹی مانگ رہا تھا۔ سلیم کے پاس ایک ہی روٹی تھی۔ بوڑھا بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ اسے بوڑھے پر بہت ترس آیا۔ اس نے وہ روٹی اس بوڑھے کو دے دی اور خود پانی پی کر خدا کا شکر ادا کیا۔ روٹی کھانے کے بعد بوڑھے نے سلیم کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بولا:

”بیٹا! کیا بات ہے؟..... تم مجھے کچھ پریشان دکھائی دیتے ہو۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ ہو سکتا ہے میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں ہے بابا۔“ سلیم نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”کوئی بات تو ہے بیٹا! بتاؤ نا، چھپاؤ مت۔“

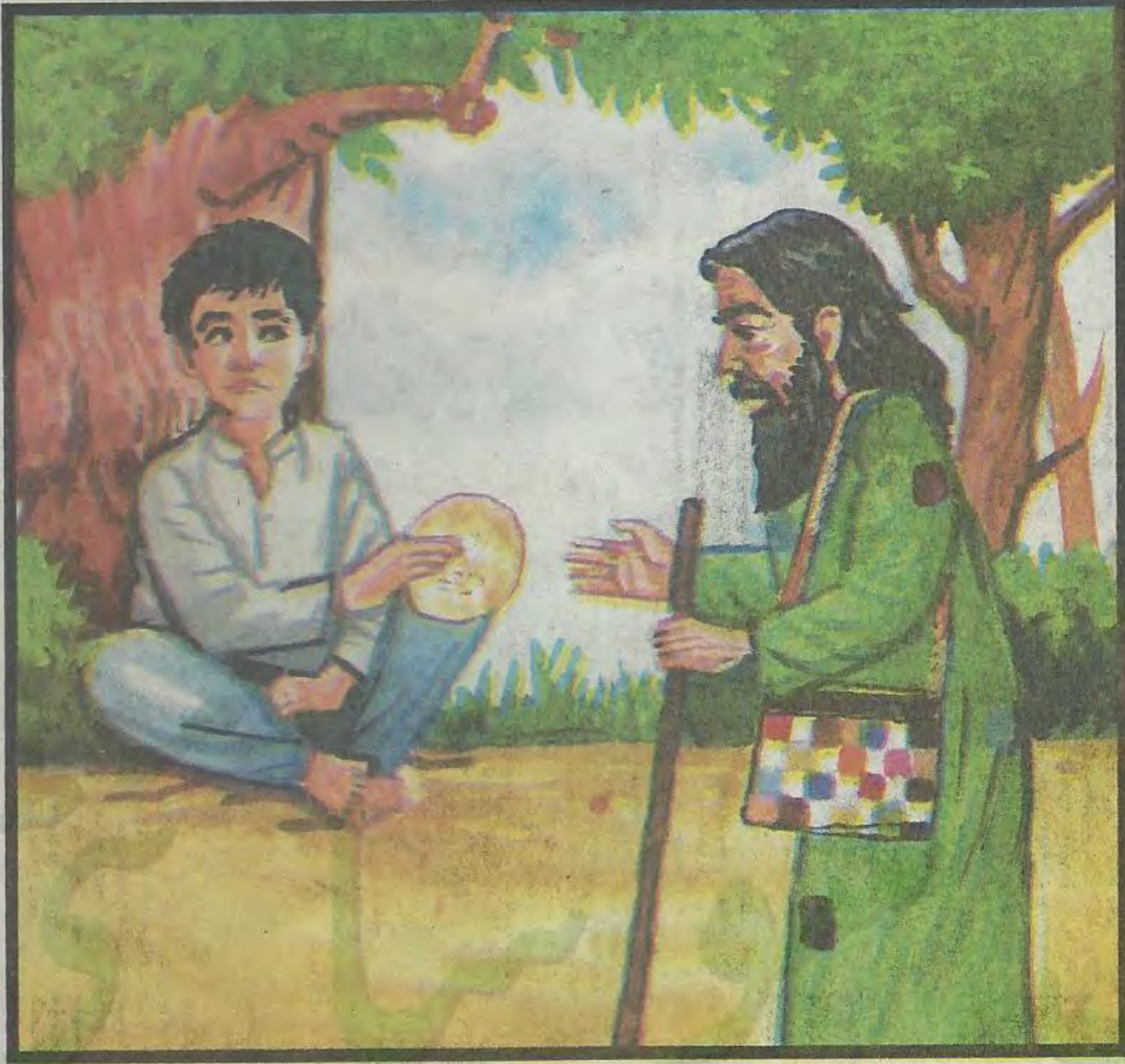
”بابا!..... وہ..... دراصل میں.....“ سلیم کہتے کہتے رک گیا۔

”ہاں ہاں! بولو نا۔“ بوڑھے نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں ایک مشکل میں پھنسا ہوا ہوں۔“ سلیم نے کہا اور پھر شہزادی اور اس کے سوالوں کے متعلق بوڑھے کو بتایا۔

”اوہ!..... اچھا..... ادھر آؤ..... میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ بوڑھے نے اسے قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ سلیم اس کے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ بوڑھے نے کہا:

”میری بات غور سے سنو..... یہاں سے جنوب کی طرف چند کوس کے فاصلے پر ایک سیاہ پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ میں ایک غار ہے۔ اس غار میں ایک درویش رہتا ہے۔ تم اس کے پاس جاؤ۔ شاید وہ تمہیں شہزادی کے سوالات کے بارے میں کچھ بتا سکے لیکن ایک بات کا خیال رکھنا.....“



”وہ کیا بابا؟“ سلیم بوڑھے فقیر کی بات کاٹ کر جلدی سے بولا۔
”وہ درویش چوبیس گھنٹوں میں صرف ایک بار اس غار سے باہر نکلتا ہے۔ تمہیں اس کے باہر نکلنے کا انتظار کرنا ہو گا۔“ بوڑھے فقیر نے بتایا۔

”ٹھیک ہے بابا!..... میں ان کے باہر آنے کا انتظار کروں گا۔“ سلیم نے کہا اور جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو بیٹا۔“ فقیر نے اسے دعا دی اور وہ اپنی اپنی منزل کو چل دیئے۔

☆☆☆

لے۔“ سلیم نے جوابات مکمل کیے۔ اب سب درباری شہزادی کی طرف دیکھنے لگے جو سپاٹ چہرہ لیے خاموش کھڑی تھی۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

”تمہارے تمام جوابات درست ہیں۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد دربار میں شہزادی کی آواز گونجی۔ پھر وہ بادشاہ کی طرف مڑی اور بولی:

”ابا حضور! میں اس ذہین اور عقل مند نوجوان سے شادی کے لیے تیار ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔
”مبارک ہو نوجوان!.....“ بادشاہ نے سلیم سے کہا، پھر درباریوں کو حکم دیا:

”شادی کی تیاریاں کی جائیں۔“ اس کے ساتھ ہی دربار برخاست ہو گیا۔ بادشاہ نے سلیم کے والدین کو بھی محل میں بلا لیا۔ یوں اس غریب کسان کے بیٹے کی شادی شہزادی نور جمال سے ہو گئی اور ایک پُر وقار تقریب میں بادشاہ جمال عبداللہ نے اپنا تاج و تخت نیک سیرت سلیم کے حوالے کر دیا۔ خوشی کے اس موقع پر جیل میں بند تمام نوجوانوں کو بھی رہا کر دیا گیا۔ اب وہ سب مل جل کر محل میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

☆☆☆

سلیم کو محل سے گئے ہوئے ابھی پندرہ دن ہوئے تھے کہ اچانک ایک دن محافظوں نے شہزادی کو اس کے آنے کی اطلاع دی۔ شہزادی بہت حیران ہوئی اور فوری طور پر اسے دربار میں بلا لیا۔
”شہزادی صاحبہ! میں نے آپ کے سوالوں کے جوابات تلاش کر لیے ہیں۔“ سلیم نے شہزادی کو بتایا۔
”بہت خوب! مجھے جوابات بتائے جائیں۔“ شہزادی نے جلدی سے کہا۔

”آپ کے پہلے سوال کا جواب ہے پسینہ۔ یہ ایک ایسا پانی ہے جو نہ تو آسمان سے برسا ہے اور نہ زمین سے نکلا ہے۔“
”بہت خوب!“ شہزادی نے جواب سن کر کہا۔

”آپ کے دوسرے سوال کا جواب ہے صبر۔ یہ ایک ایسا پھل ہے جو میٹھا ہونے کے باوجود بازار میں نہیں بکتا اور آپ کے تیسرے سوال کا جواب ہے کانوں کا پکا ہونا۔ ایک بادشاہ کے لیے سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ کانوں کا کچا نہ ہو یعنی کسی کی بات پر اس وقت تک یقین نہ کرے جب تک اس کی تصدیق نہ کر

کشمیر کی کہانی



رانا محمد شاہد

کشمیر..... جسے دنیا جنت نظر کہتی ہے، آج سے تقریباً دس کروڑ سال قبل دریافت ہوا تھا۔ اس سے پہلے یہ علاقہ ایک بہت بڑا سمندر تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پانی کم ہونا شروع ہوا تو وہاں ایک پہاڑ نمودار ہوا۔ اس پہاڑ کو کوہ سلیمان کہتے تھے۔ جب پانی کم ہوتا گیا تو پہاڑی چوٹیاں نمودار ہونے لگیں۔ یہ کوہ ہمالیہ کی چوٹیاں تھیں۔ یہ پہاڑی چوٹیاں بلند ہوتی گئیں۔ یہ علاقہ ایک پیالے کی مانند ہو گیا، جس میں پانی بھرا ہوا ہو۔ چاروں طرف پانی اور درمیان میں ایک بڑی جھیل جو پانی کے جمع ہونے سے بن گئی۔ اس جھیل کا نام ستی سر تھا۔ پانی کی وجہ سے لوگ یہاں آباد ہونا شروع ہو گئے۔

اس جھیل کے حوالے سے ایک کہانی بھی بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک روز اچانک جھیل سے ایک بڑا دیونکل آیا۔ لوگ اس دیو کو دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے۔ اس دیو کا نام جلود بھاؤ تھا۔ دیو یہاں کے رہائشیوں کو تنگ کرنے لگا۔ لوگ پریشان رہنے لگے۔ ایک روز ایک بزرگ اس علاقے کی طرف آنکے۔ بزرگ کچھ دیر خاموش رہے، پھر بولے۔ ”وہ سامنے جو بارہ مولہ کا پہاڑ

ہے، یہ قدرے چھوٹا ہے۔ اگر آپ سب لوگ ہمت کریں اور اس پہاڑ کو کاٹ دیں تو اس سے پانی باہر نکلنے لگے گا۔ جب پانی جگہ بنا کر نکل جائے گا تو نہ پانی رہے گا اور نہ دیو.....“ لوگوں کے نزدیک یہ خاصا مشکل کام تھا لیکن دیو کے خوف میں جکڑے لوگوں نے ہمت کی اور انہوں نے بارہ مولہ کا پہاڑ کاٹنا شروع کر دیا۔ کچھ عرصہ گزرا تو وہ پہاڑ کا ایک بڑا حصہ کاٹ چکے تھے اور پانی کو جھیل سے باہر نکلنے کا راستہ بھی مل گیا۔ پہلے پانی آہستہ آہستہ جھیل سے باہر جانے لگا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راستہ بنتا گیا اور وہاں صرف ایک چھوٹی سی جھیل باقی رہ گئی۔ یہ جھیل نہیں بلکہ ایک بڑا تالاب تھا۔ یہ جھیل نما تالاب وہاں موجود دیو کے لیے ناکافی تھا۔ وہ دیو بھی مر گیا اور وہاں کے لوگوں کو سکون کا سانس آیا۔

لوگوں نے اپنے اس محسن بزرگ کے نام پر اس علاقے کا نام ”کشپ میر“ رکھا۔ ”کشپ“ ان بزرگ کا نام تھا جب کہ ”میر“ وہاں کے لوگ جگہ کو کہتے تھے..... یعنی ”کشپ میر“۔ چنانچہ ”کشپ میر“ آہستہ آہستہ کشمیر بن گیا۔

کشپ میر سے کشمیر بننے تک ہزاروں سال گزر گئے۔ آبادی

بڑھتی گئی۔ سینکڑوں حکومتیں آئیں اور گزر گئیں۔ محمد بن قاسم نے جب سندھ پر حملہ کیا تو راجہ داہر کو شکست دی۔ راجہ داہر کا بیٹا بے سنگھ بھاگ کر سندھ سے کشمیر آ گیا۔ اس کے ساتھ اس سفر میں ایک مسلمان صحیح بن سامہ بھی تھا۔ کشمیر میں اس وقت ایک ہندو راجہ سہد یو کی حکومت تھی۔ اس نے بے سنگھ کو نہ صرف رہنے کو جگہ دی بلکہ مال و دولت سے بھی نوازا۔ صحیح بن سامہ بھی اس کے ساتھ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ کشمیر میں داخل ہونے والا پہلا مسلمان تھا۔

کشمیر پر صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ 1319ء میں ایک چنگیزی سردار ذوالقدر خان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ اس وقت کشمیر پر اسی راجہ سہد یو کی حکومت تھی۔ وہ اس حملے کے بعد افراتفری کے عالم میں ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اس موقع سے ایک تبتی شہزادے رنجن شاہ نے فائدہ اٹھایا اور کشمیر پر اپنی حکومت قائم کر لی۔

اس زمانے میں حضرت عبدالرحمن بلبل شاہ کشمیر میں تبلیغ دین کے لیے آئے تو اس مسلمان درویش کے ہاتھوں پر رنجن شاہ نے اسلام قبول کر لیا اور اپنا نام سلطان صدرالدین رکھا۔ وہ کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران تھا۔ سلطان صدرالدین 1325ء سے 1327ء تک کشمیر پر حکمران رہا۔ صدرالدین کے بعد دو سو سال تک اپنی نسل کی حکمرانی کی بنیاد ڈالی۔ سلطان شمس الدین 1339ء سے 1342ء تک برسر اقتدار رہا۔ اس دور میں کشمیر میں اسلام کی تبلیغ کا خوب کام ہوا۔ سلطان شہاب الدین جن کا دور اقتدار 1360ء سے 1378ء ہے، کے عہد میں ایران کے مشہور صوفی بزرگ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی سات سو مبلغین اسلام کے ساتھ تبلیغ اسلام کے لیے تشریف لائے۔ آپ کی آمد کے ساتھ کشمیر میں اسلام اور ہندومت کی کشمکش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ برہمنوں نے اسلامی تعلیمات کے خلاف خوب محاذ آرائی کی، لیکن ان کی ساری مخالفت، مبلغین اسلام کے سامنے اکارت گئی۔ اسلامی طریقے اور اخلاقی قدریں کشمیری لوگوں کے جسم میں روح کی طرح داخل ہو گئیں۔ یوں کشمیر میں ایک عظیم الشان مذہبی و تمدنی انقلاب کی بنیاد پڑی۔

پھر ماہ و سال کے بعد کشمیر پر ایک ایسا حکمران تخت نشین ہوا جس کے عہد کو کشمیر کی تاریخ کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اس حکمران

کا نام سلطان زین العابدین بڈ شاہ تھا۔ سلطان زین العابدین بڈ شاہ نے 1420ء سے 1470ء تک کشمیر پر حکومت کی اور کشمیر کو شاہراہ ترقی پر چلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے بعد چک، مغل، افغانیوں اور سکھوں نے بھی وقتاً فوقتاً کشمیر پر حکومت کی۔ 1753ء میں احمد شاہ ابدالی نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور اسے افغانستان میں شامل کر لیا۔ یوں کشمیر پر افغانی طویل عرصے یعنی تقریباً 68 سال تک برسر اقتدار رہے۔ پھر 1819ء میں سکھوں نے کشمیر پر حملہ کر دیا اور اس پر قابض ہو گئے۔ یہ حملہ پنجاب کے سکھ حکمران رنجیت سنگھ نے کیا تھا۔ رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے کا ایک کشمیری پنڈت بیربل نے اکسایا تھا۔ کشمیر پر سکھوں کا قبضہ یہاں کے مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ یہ تبدیلی کشمیری مسلمانوں کی بد قسمتی اور غلامی کے دور کا آغاز ثابت ہوئی۔

اس دور میں کشمیریوں پر بے پناہ ظلم ڈھائے گئے۔ اس وقت کشمیریوں کا حال یہ تھا کہ دن رات کروکے وہ جو فصلیں کاشت کرتے، کٹائی کے وقت انہیں صرف ایک حصہ ملتا۔ باقی کے 9 حصے سکھ افسر چھین کر لے جاتے۔ کوئی صدائے احتجاج بلند کرتا تو اسے جان سے مار دیا جاتا۔ سکھوں کے لیے کشمیریوں کو مارنا مشکل نہ تھا۔ یہاں تک مشہور تھا کہ جس سکھ کے پاس 16 روپے ہوتے، وہ یہ کام باسانی کر گزرتا۔ سکھوں نے مختلف طرح کے ناجائز ٹیکس کشمیریوں پر عائد کر رکھے تھے۔ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض سے روکا جاتا، مساجد میں تالے ڈال دیے جاتے۔

کشمیری غلام تو سکھوں کے دور سے چلے آ رہے تھے لیکن پھر اس وقت ان کے بدترین دور کا آغاز ہو گیا۔ جب انگریزوں نے 75 لاکھ نانک شاہی روپوں کے عوض اسے ایک ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ دوسرے الفاظ میں ایک کشمیری سات روپے میں بیچا گیا۔ اس موقع پر علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

”قومے فروختند چہ ارزاں فروختند“

ترجمہ: ”قوم کو بیچا گیا اور افسوس کہ نہایت سستے داموں بیچا گیا۔“

گلاب سنگھ کشمیر کا ایک سفاک ترین حکمران تھا۔ اس نے

مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کیا۔ اس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کی زندہ کھالیں کھچوا دیا کرتا تھا۔ ڈوگرہ حکومت میں بھی مسلمانوں کی حالت نہیں بدلی۔ ملازمت اور تجارت پر غیر مسلم چھائے رہے۔ مسلمانوں سے بیگار لی جاتی۔ مسلمانوں کے چولہا رکھنے اور بھیڑ پالنے پر ٹیکس عائد تھا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ مسلمان دریا سے مچھلی تک نہیں پکڑ سکتے تھے۔ کشمیری مسلمان کی بقاء و سلامتی خطرے میں پڑ گئی۔ پھر ہری سنگھ کشمیر کا حکمران بنا۔ ہری سنگھ کے دور میں ایک دو ایسے واقعات ہوئے جن سے مسلمانوں کے اندر سے خوف اور ناامیدی جاتی رہی یعنی مسلمان خواب غفلت سے بیدار ہو گئے۔ مسلمان ہر چیز برداشت کر سکتا ہے مگر قرآن پاک اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا اور نہ ہی وہ مذہب کے معاملے میں کسی پابندی کو برداشت کرتا ہے۔ چنانچہ ایک دو ایسے واقعات ہوئے جن کی وجہ سے کشمیری مسلمانوں میں ڈوگرہ حکومت کے خلاف نفرت ایک لاوے کی شکل اختیار کر گئی۔

مسئلہ کشمیر کی اصل ابتدا اس وقت ہوئی جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ تقسیم ہند اسی بنیاد پر ہوئی تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان میں اور ہندو اکثریت کے علاقے بھارت میں شامل ہوں گے۔ کشمیر مسلم اکثریتی صوبہ تھا، اصولاً اسے پاکستان کے ساتھ شامل ہونا چاہیے تھا۔ کشمیری مسلمان بھی 19 جولائی 1947ء کو پاکستان کے ساتھ الحاق کی قرارداد منظور کر چکے تھے اور قیام پاکستان کے بعد ڈوگرہ راج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اسی جدوجہد میں کشمیر کا کچھ حصہ آزاد کرا لیا گیا اور 24 اکتوبر 1947ء کو اس حصے میں آزاد حکومت قائم ہوئی، جسے آج ہم آزاد کشمیر کہتے ہیں۔ 27 اکتوبر 1947ء میں مسلمانوں کے حملوں کے ڈر سے مہاراج ہری سنگھ ہندوستان بھاگ گیا اور وہاں کے ہندوؤں کو مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے اکسایا۔ چنانچہ ہندوستان نے اپنی فوجیں طیاروں کے ذریعے سری نگر میں اتار دیں اور یوں ان کی مجاہدین کشمیر سے جنگ شروع ہو گئی۔ جو بالآخر 1948ء میں اقوام متحدہ کی کوششوں سے رُک گئی۔ بھارت کے اس وقت

کے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا۔

”ہم نے اس الحاق کو قبول کرنے اور فضا سے اپنی فوجیں بھیجنے کا فیصلہ تو کر لیا لیکن ہم نے یہ شرط بھی عائد کر دی ہے کہ آخر کار جب امن اور قانونی نظام بحال ہو جائے گا تو کشمیری عوام خود الحاق کا فیصلہ کریں گے۔“ اسی طرح کے خیالات کا اظہار انہوں نے برطانوی وزیراعظم کے نام ایک ٹیلی گرام میں بھی کیا۔ اس کے بعد ہی آج تک بھارت نے کشمیریوں کو قوت کے بل بوتے پر زیر کیا اور ان کے حقوق غصب کیے۔ اقوام متحدہ کی بار بار کی قراردادوں کے باوجود اس بات پر اتفاق ہوا کہ کشمیر میں اقوام متحدہ کی زیر نگرانی رائے شماری کرائی جائے۔ بھارت کا رویہ اس دوران منافقانہ رہا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، بھارت اپنے ہی بیانات سے انحراف کرنے لگا اور کشمیر کو اپنا حق ملکیت قرار دینے لگا، بلکہ کشمیر کو اپنا الٹو انگ تک کہنا شروع کر دیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کشمیر کے لیے باقاعدہ مسلح جدوجہد کا آغاز ہوا۔

تحریک آزادی کی ابتدا میں مقبوضہ کشمیر میں بھارت کی دو اڑھائی لاکھ فوج تھی مگر جیسے جیسے کشمیر کی تحریک آزادی زور پکڑتی گئی، فوج کی تعداد بھی بڑھتی گئی اور ان کے ظلم میں بھی اضافہ ہو گیا۔ آج یہ تعداد کم و بیش دس لاکھ ہو چکی ہے۔ بھارت نے کشمیری مسلمانوں کو آزادی کی جدوجہد سے روکنے کے لیے ظلم و تشدد کا ہر حربہ استعمال کیا، مگر وہ کشمیریوں کے جذبہ حریت کو نہ دبا سکا۔ لاکھوں مجاہدین، آزادی کی جدوجہد میں شہادت کا بلند مقام پا چکے ہیں۔ حق و انصاف کے لیے کشمیریوں کی جدوجہد آج بھی جاری ہے۔

یہ تھی اس کشمیر کی کہانی جس کا دن ہم ہر سال 5 فروری کو مناتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے اسی خوبصورت وادی کے متعلق کہا تھا۔

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

اے وادیِ لولاب!

☆☆☆

آئیے عہد کریں



جیسے ہی اذان ہوئی، ابا جان نے سب بچوں کو وضو کرنے کا کہا۔ آج ابا جان بہت خوش تھے کہ ان کے پوتے پہلی بار مسجد میں جا رہے تھے کیوں کہ ان کی عمریں تقریباً ساڑھے سات سال کی ہو گئی تھیں۔ ان پر نماز فرض ہو گئی تھی لہذا ابا جان انہیں آج مسجد میں لے کر جا رہے تھے۔ ابا جان خود بھی ہمیشہ باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔ وہ بچوں کو لے کر باہر نکلے۔ پڑوسیوں کے بچے بھی ساتھ ہو لیے۔ بچے اندر داخل ہوئے تو آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ بچے صفوں پر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ابا جان نے سب بچوں کو خاموش کرایا اور انہیں مسجد کے آداب بتانے شروع کیے۔ پیارے بچو! حضور اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ مسجدوں میں شور نہ کرو، خرید و فروخت نہ کرو۔ مسجد میں لڑائی جھگڑا اور تلواریں نہ نکالو۔ یہ سب باتیں مسجد کے تقدس اور احترام کے خلاف ہیں۔ سب بچے بہ غور سن رہے تھے۔ اب ان بچوں نے صفیں درست کیں اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ان سب بچوں نے عہد کیا کہ وہ مسجد میں شور نہیں کریں گے اور نہ ہی لڑائی جھگڑا کریں گے۔ پیارے بچو! آپ بھی کوشش اور عہد کریں کہ مسجد کے تقدس کا احترام کریں گے۔



شاباش ان بچوں نے بھی عہد کیا کہ وہ بھی چھوٹوں سے شفقت اور پیار سے پیش آئیں گے۔

عائشہ کریم، ملتان۔ علیہ احمد، راول پنڈی۔ زین شیراز، لاہور۔ محمد رامت، ادکاڑہ۔ مجتبیٰ، انک۔ عباد الرحمن، کراچی۔ ارسلان، کراچی۔ محمد صدیق، کراچی۔ اسامہ، کراچی۔ مہلب، گوجرانوالہ۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادن خان۔ شفیق فاطمہ، راول پنڈی۔ دروج اسلم، راول پنڈی۔ زبیرہ جمال، پشاور۔ محمد منان شاہد، لاہور۔ ہدیٰ، اسلام آباد۔ رباب افتخار، فیصل آباد۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی۔ محمد اجمل شاہین انصاری، چوہنگ۔ فرحان امجد، لاہور۔ احسن اعجاز، کراچی۔ محمد بلال عباس، لاہور۔ محمد عمیس تنویر، کلور کوٹ۔ محمد عبداللہ ہاشم، لاہور۔ عروہ ملک، لاہور۔ ملک واصف رحمن، جہلم۔ خبیب علی نصر اللہ، اسلام آباد۔ ارحم اللہ خان، اسلام آباد۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ محمد عرفان اقبال، دنیا پور۔ عرتج ذوالفقار، لاہور۔ حسنین انصرمان، قلعہ دیدار سنگھ۔ کشف ارشد، گوجرانوالہ۔ مریم عتیق، لاہور۔ معیزہ اسحاق، واہ کینٹ۔ اشع طارق، گوجرانوالہ۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ حسین احمد ورک، راول پنڈی۔ آمنہ علی، اسلام آباد۔ فاطمہ حسین فیضی، سرگودھا۔ محمد تاثیر مہدی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عاصم محمود، اسلام آباد۔ علی حیدر، راول پنڈی۔ آفتاب عدیل، لاہور۔ امین امجد، راول پنڈی۔ درنشین خان، بھکر۔ محمد مجیر خان، بھکر۔ مبشر حنیف جوشی، روڈو سلطان۔ سمیعہ یوسف، لاہور۔ احمد ارتضیٰ، کمالیہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد عبداللہ راشد، کوٹ موئن۔ نوال فاطمہ جنجوعہ، اسلام آباد۔ عیشاء افضل، گوجرانوالہ۔ عامر سہیل، بھکر۔ عروج نوید، لاہور۔ دُر مکتون، گجرات۔ محمد عون عبداللہ، واہ کینٹ۔ رانا بلال احمد، کوٹلہ جام ضلع بھکر۔ محمد حظلہ فاروق، کوٹلہ جام ضلع بھکر۔ محمد حمزہ سعید، بورے والا۔ محمد صادق علی، بہار کالونی کوٹری۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ رابعہ سلیم، فیصل آباد۔ محمد کلیم، بھکر۔ محمد اکرام اللہ، بہاول پور۔ شہزاد حیدر شیخ، لاہور۔ محمد شہریار اظہر، اسلام آباد۔ کامران ہمایوں، لاہور۔

پیارے اللہ کے پیارے نام

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پوچھیں کہ وہ کیا باتیں ہیں جو اس نے اپنے دل میں کہیں۔ وہ باتیں جو اس کے کانوں نے بھی نہیں سنیں۔“
جب یہ شخص اپنے والد کو لے کر پہنچا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کے والد سے دریافت فرمایا: ”کیا بات ہے؟ آپ کا بیٹا آپ کی شکایت کرتا ہے۔ کیا آپ اس کا مال چھیننا چاہتے ہیں۔؟“

والد نے عرض کیا: ”آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسی سے یہ سوال فرمائیں کہ میں اس کا مال اس کی پھوپھی، خالہ یا صرف اپنے اوپر خرچ کرنے کے علاوہ کہاں خرچ کرتا ہوں؟“

یہ جواب سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”بس حقیقت معلوم ہو گئی، اب اور کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔“ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے والد سے پوچھا:

”وہ کیا باتیں ہیں جنہیں تم نے اپنے دل میں کہا، اور جن کو ابھی تک تمہارے کانوں نے بھی نہیں سنا وہ مجھے بھی سناؤ۔“ اس شخص نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمارا یقین اور بڑھ جاتا ہے کہ وہ بات جو میرے کانوں نے نہیں سنی، اللہ تعالیٰ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع فرما دیتے ہیں۔“

پھر اس شخص نے کہا: ”یہ ایک حقیقت ہے کہ میں نے چند

اَلْعَلِیْمُ جَلَّ جَلَالُہُ (سب کچھ جاننے والا)

اَلْعَلِیْمُ جَلَّ جَلَالُہُ سے زمین و آسمان میں کوئی چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے اور مخلوق میں سے کوئی اگر کچھ اپنے سینے میں چھپانا چاہے تو نہیں چھپا سکتا۔ اسے ہر چیز کا علم ہے۔

یہ اسم مبارک قرآن کریم میں 157 مرتبہ آیا ہے۔

ساری دُنیا کے سمندروں میں کتنے قطرے ہیں؟ ساری دُنیا کی ریت کے کتنے ذرات ہیں؟ اب تک بارش کی کتنی بوندیں برس چکی ہیں اور آئندہ کتنی بوندیں برسیں گی، ان سب کا اسے علم ہے۔ اسے درخت سے گرنے والے ہر پتے کا بھی علم ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ درخت کا یہ پتا درخت پر کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا، کب اور کہاں گرے گا؟ یہ سب علم اس کے پاس ہے۔

دل کی بات

ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور شکایت کی: ”میرے والد نے میرا مال لے لیا ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اپنے والد کو بلا کر لاؤ۔“

اسی وقت حضرت جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: ”جب اس کے والد آجائیں تو

اشعار اپنے دل میں کہے تھے جن کو میرے کانوں نے بھی نہیں سنا، وہ میں نے غم کی حالت میں دل ہی دل میں کہے تھے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ ہمیں بھی سناؤ۔ پھر اس نے دل میں آنے والے وہ دردناک اشعار سنائے۔

۱۔ اے بیٹے! میں نے بچپن میں تیری غذا کا انتظام کیا اور جوان ہونے کے بعد بھی تمہاری ذمہ داری اٹھائی، تمہارا سب کھانا پینا میری ہی کمائی سے تھا۔

۲۔ جب کسی رات میں تمہیں کوئی بیماری پیش آگئی تو میں نے تمام رات تمہاری بیماری کی وجہ سے جاگنے اور بے قراری میں گزار دی۔

۳۔ ایسا لگتا جیسے تمہاری بیماری مجھے ہی لگی ہے تمہیں نہیں، جس کی وجہ سے میں تمام رات روتا رہا۔

۴۔ میرا دل تمہاری موت سے ڈرتا رہا حالاں کہ میں جانتا تھا کہ مرنے کا ایک دن مقرر ہے جو آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتا۔

۵۔ پھر جب تم اس عمر اور اس حد تک پہنچ گئے جس کی میں تمنا کیا کرتا تھا۔

۶۔ تو تم نے میری شفقت کا بدلہ سختی اور سخت بات سے دیا جیسے تم ہی نے مجھ پر احسان کیا۔

۷۔ کاش! اگر تم سے میرے باپ ہونے کا حق ادا نہیں ہو سکتا تو کم از کم ایسا ہی کر لیتے، جیسا ایک شریف پڑوسی دوسرے پڑوسی سے کیا کرتا ہے۔

۸۔ کم از کم مجھے پڑوسی جیسا حق دیتے اور خود میرے ہی مال میں میرے واسطے کنجوسی نہ کرتے۔

یہ اشعار سننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم غمگین ہو گئے اور فرمایا: ”جا تو بھی اور تیرا مال بھی سب تیرے باپ کا ہے۔“

علم میں اضافہ

اللہ تعالیٰ سے اپنے علم میں اضافے کے لیے ہر وقت دعا مانگنی چاہیے۔ جب بھی لکھنے پڑھنے کا کام کرنا ہو تو یہ دعا پڑھ لینی چاہیے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس دعا کی برکت سے ہمارے علم میں

اضافہ ہو جائے گا:

اللَّهُمَّ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا.

ترجمہ: اے اللہ! میرے علم میں اضافہ فرما۔

اہم نکات

☆ اس نام مبارک کے پڑھنے سے ہمیں یہ سبق ملا کہ ہمیں یقین ہو کہ کائنات کی ہر شے کا علم صرف ایک اللہ کے پاس ہے۔ سب کو علم اسی نے عطا فرمایا ہے۔ کسی بھی انسان کا علم اَلْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ جیسا نہیں۔ انسان کو تو بس اتنا علم ہے جو اس نے انسانوں کو دیا ہے۔

☆ اس اَلْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ نے اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہمیں یہ بات بتائی کہ ”علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔“ لہذا ہمیں خوب دل لگا کر علم حاصل کرنا چاہیے۔ جماعت میں اپنے اپنے ہم جماعتوں سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اپنے علم میں اضافے کے لیے اَلْعَلِيمُ جَلَّ جَلَالُهُ سے مدد اور دعا مانگتے رہنا چاہیے۔

☆ علم میں اضافے کے لیے لکھنے پڑھنے سے پہلے یہ دُعا اَللَّهُمَّ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا مانگتے رہنا چاہیے۔

برائی کے بدلے بھلائی

ایک اوباش نوجوان شراب کی مستی میں جا رہا تھا۔ ایک نیک آدمی اس کے پاس سے گزرا تو بربط اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا اور اس کی اس حرکت سے بربط ٹوٹ گیا۔ یہ حرکت بہت نازیبا تھی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو مار مار کر اوباش کا سارا نشہ اتار دیتا لیکن اس نیک مرد نے صبر کیا بلکہ مزید احسان یہ کیا کہ دوسرے دن بھی کچھ رقم لے کر اس اوباش کے پاس گیا اور بہت شفقت سے کہا کہ برادر! تو نے نشے کی حالت میں اپنا بربط میرے سر پر دے مارا تھا، جس سے دونوں کا نقصان ہوا۔ میرا سر زخمی ہو گیا اور تیرا ساز ٹوٹ گیا۔ خدا نے چاہا تو میرا سر جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا لیکن تیرا بربط بغیر روپے کے ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ میں یہ حقیر رقم لایا ہوں، قبول کرو اور اپنا بربط ٹھیک کرالے۔



باباجی

بچے تھے جس کی وجہ اس کا بڑی عمر میں شادی کا ہونا تھا۔ سب سے بڑی بیٹی 12 سال کی تھی اور باقی دو بیٹے چھوٹے تھے۔

تصدق صاحب باباجی کے پڑوس میں رہتے تھے اور الیکٹریشن کا کام کرتے تھے۔ انہیں باباجی کی حالت زار پر بہت ترس آتا تھا، اس لیے انہوں نے ان کی غربت کا احساس کرتے ہوئے اپنی دکان کے سامنے سبزی کا پھٹا لگانے کو کہا جسے باباجی نے بخوشی قبول کر لیا اور اپنا کام شروع کر دیا۔ تصدق، باباجی سے کوئی کرایہ وغیرہ نہیں لیتے تھے۔ آہستہ آہستہ باباجی کا کاروبار بھی اچھا چلنے لگا اور اس کے گھر کے حالات بھی بہتر ہونے لگے تھے۔

وقت تیزی سے سمندر کی لہروں کی طرح گزرتا گیا۔ ایک دن تصدق کی بیوی اس سے بولی کہ آپ اس بڑھے سے کرایہ کیوں نہیں لیتے؟ مفت میں عیش و آرام کر رہا ہے جیسے اس کے باپ کی دکان ہو۔ تصدق کو اس کی بات پر بہت غصہ آیا لیکن وہ اس وقت چپ کر گیا۔ کچھ دن بعد پھر یہی بات ہوئی تو تصدق نے اپنی بیوی سے کہا کہ باباجی ایک غریب انسان ہیں، وہ ہمارے پڑوسی اور

آلو 30 روپے کلو، گاجر 20 روپے کلو، کیلا 40 روپے درجن، سیب 20 روپے کلو..... لوٹ لو، لوٹ لو..... یہ اس باباجی کی آواز تھی جو 60 سال کی عمر میں ایک جوان آدمی سے بھی زیادہ اونچی اور گرج دار آواز میں گاہکوں کو اپنی طرف پکار رہا تھا۔ اس کا چھوٹا سا پھٹا سبزی اور پھلوں سے لدا پڑا تھا اور اس کے ارد گرد خریداروں کا رش لگا ہوا تھا اور باباجی بڑی خوشی سے سامان شاپر میں ڈال کر دے رہا تھا، گویا جنگل میں منگل کا سماں تھا۔

☆☆☆

اپنی بیوی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے باباجی غم سے ٹڈھال ہیں اور آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی لڑیاں موتیوں کی طرح ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں کو چومتی نیچے گر رہی ہیں۔

بیوی اپنے شوہر کو ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں تسلی دینے کی کوشش کر رہی ہے کہ کوئی بات نہیں صبر کرو اللہ ہمیں صبر کا پھل ضرور دیں گے۔

باباجی ایک غریب آدمی تھے اور اس کے تین چھوٹے چھوٹے

رشتے دار بھی ہیں۔ پھر کیا ہے اگر وہ کرایہ نہیں دیتے؟ بزرگ آدمی ہیں، دعا ہی دیتے ہوں گے۔

اس کی بیوی یہ بات سن کر غصے سے سانپ کی طرح بل کھا گئی اور اپنی بات پر ہی اٹکی رہی۔ کچھ دن سے تصدق، بابا جی سے پہلے سے مختلف موڈ میں ملتا اور اس سے صحیح طریقے سے بات بھی نہیں کرتا تھا۔ پھر ایک دن تصدق نے بابا جی کا ایک ہزار روپے ماہوار کرایہ مقرر کر دیا۔

اب بابا جی کو ہر مہینے کے آخر میں زہر کا پیالہ، ایک ہزار روپے کرایہ کی صورت میں پینا پڑتا تھا لیکن اللہ پاک بابا جی کو اپنی خاص کرم نوازی سے نواز رہے تھے اور بابا جی کافی حد تک اپنی اولاد کی کفالت کرنے میں خوش حال نظر آ رہے تھے۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ اب تصدق کے دل میں بھی لالچ اور طمع نے جگہ بنانی شروع کر دی، اس نے بابا جی کا کرایہ دو ہزار روپے کر دیا۔ بابا جی کو بہت صدمہ ہوا لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا اور ایک پھٹے کا کرایہ دو ہزار روپے واقعی زیادہ تھا۔ خیر اس نے چپ سا دھنے میں ہی عافیت جانی۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا اور اب تو تصدق کو بابا جی کے کاروبار سے حسد ہونے لگا تھا۔ آخر کار بات یہاں تک آن پہنچی کہ بابا جی کو یہاں سے اٹھوا دیا جائے۔ اس کے لیے وہ بازار کے سب سے ملعون اور پنگے باز آدمی نعمان سے ملا جو اپنے کاروبار میں کم، کسی کا دل دکھانے اور لڑائی جھگڑے میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے بابا جی کا بالکل ستیاناس کر دیا اس نے بازار میں رکاوٹ پیدا کرنے اور سڑک پر پھٹا لگانے کے الزام میں بابا جی کے خلاف TMA کو درخواست دے دی جس پر بابا جی کا پھٹا اٹھوا دیا گیا اور ساتھ ہی ایف آئی آر بھی کٹ گئی۔

بھاری جرمانے نے بابا جی کی بوڑھی کمر مزید توڑ کر رکھ دی اور اب بابا جی کے لیے کوئی دوسرا ذریعہ معاش بھی نہیں تھا جس سے وہ اپنا اور بھوک سے بلکتے بچوں کا پیٹ پال سکتا۔ اب رونا دھونا ہی اس کا مقدر بنتا دکھائی دے رہا تھا۔

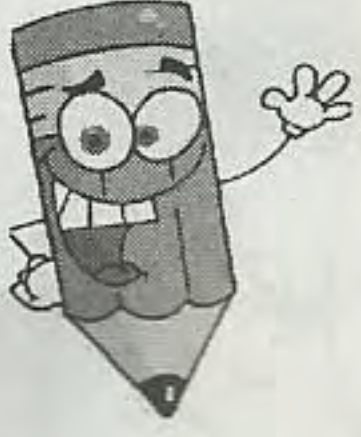
کہتے ہیں کہ حسد کا انجام بُرا ہوتا ہے، تصدق کے ساتھ بھی

ایسا ہی ہوا۔ ایک دن زور کی بارش کے ساتھ آندھی بھی آئی جس سے کافی لوگوں کے بجلی کے کنکشن خراب ہو گئے۔ کچھ لوگوں کے میٹر شارٹ ہو گئے جن میں سے ایک تصدق کا بھی تھا۔ الیکٹریشن ہونے کی وجہ سے اگلے دن صبح ہی صبح وہ بجلی کے کھمبے پر چڑھ کر کنکشن ٹھیک کرنے لگا۔ بارش کی وجہ سے نہ صرف تاریں گیلی ہو گئیں تھیں بلکہ میٹر کے اندر تک پانی جمع ہو چکا تھا اور کچھ تاریں آپس میں ملی ہوئی تھیں۔ تصدق نے جیسے ہی ہاتھ لگایا، اس کو بجلی کا ایک زور دار جھٹکا لگا اور وہ دُور جا گرا اور گرتے ہی بے ہوش ہو گیا۔ جب محلے والوں نے دیکھا تو شور مچا دیا اور اسے اٹھا کر قریبی ہسپتال لے گئے۔ اس کو خون کی اشد ضرورت پڑی۔ ان کے بھائی اور کزنز جو وہاں موجود تھے، ان کا بلڈ گروپ چیک کیا گیا لیکن کسی کا بھی بلڈ گروپ تصدق سے نہ ملا۔ کچھ ہی دیر میں بابا جی کو پتا چلا تو وہ بھی تیز تیز قدم اٹھاتے ہسپتال پہنچے۔ انہوں نے اپنا بلڈ گروپ چیک کروایا جو کہ تصدق کے گروپ سے مل گیا اور بابا جی خون کی بوتل دینے کے لیے راضی ہو گئے۔ ان کا خون فوراً تصدق کو لگایا گیا اور باقی میڈیسن بھی دی گئی۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد تصدق کو ہوش آنے لگا۔ جیسے ہی اس نے آنکھیں کھولیں تو بابا جی کو دیکھ کر بہت شرمندہ ہوا۔ کچھ دیر بعد اس کے بھائی بھی پہنچ گئے۔ جب اس کے بھائیوں نے تصدق کو بتایا کہ اس کی زندگی بابا جی نے خون دے کر بچائی ہے تو تصدق کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور اس کا سر شرم سے جھک گیا۔ اس کی آنکھوں سے بہتا پانی اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ اسے اپنے کیے پر سخت شرمندگی ہو رہی ہے اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے اور وہ ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

قائد اعظمؒ نے فرمایا:

”کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ کوئی خود دار قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اپنی شہ رگ دشمن کی تلوار کے حوالے کر دے۔“



سوال یہ ہے کہ.....!

انعامی سلسلہ

- ۱۔ اَلْعَلِيمُ کا کیا مطلب ہے؟
 - ۲۔ ”یوم کشمیر“ کس تاریخ کو منایا جاتا ہے؟
 - ۳۔ صدیق سالک کی شہادت کب اور کیسے ہوئی؟
 - ۴۔ تانبا اور لوہا ملانے سے کون سی دھات بنتی ہے؟
 - ۵۔ امریکہ پہلے صدر جارج واشنگٹن کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
 - ۶۔ دنیائے کرکٹ کے ٹیسٹ میچز میں پاکستان کو کب شامل کیا گیا؟
- درج بالا سوالوں کے جوابات فروری 2014ء کے شمارے میں موجود ہیں۔ آپ رسالہ غور سے پڑھیے اور اپنے جوابات لکھ بھیجئے۔ درست جواب دینے والے تین خوش نصیبوں کو 300 روپے کی انعامی کتب دی جائیں گی۔ تین سے زیادہ درست حل آنے کی صورت میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جائیں گے۔

جنوری 2014ء میں بہ ذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کے نام:

3- علینہ احمد، راول پنڈی

2- ثمرہ ریاض، گجرات

1- فاطمہ آفتاب، کراچی

آئیے عہد کریں

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 فروری 2014ء ہے۔

نام _____ مقام _____
میں عہد کرتا/کرتی ہوں کہ _____
موبائل نمبر: _____

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2014ء ہے۔

کھوج

لگائیے

نام:

شہر:

مکمل پتا:

موبائل نمبر:

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 فروری 2014ء ہے۔

دماغ لڑاؤ

نام:
مقام:

مکمل پتا:

موبائل نمبر:

کوپن ارسال کرنے کی آخری تاریخ 10 فروری 2014ء ہے۔

سوال یہ ہے کہ.....!

عمر

نام

مکمل پتا:

موبائل نمبر:

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام _____ شہر _____
مقاصد _____
موبائل نمبر: _____

فروری کا موضوع وادی کشمیر ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 فروری 2014ء ہے۔

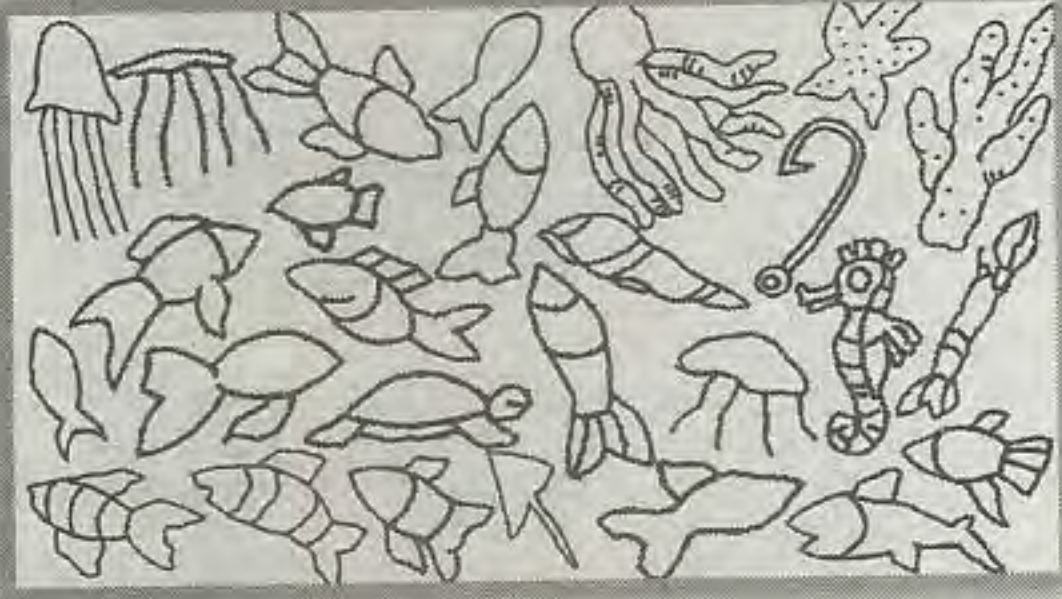
ہونہار مصور

عمر

نام

مکمل پتا:

موبائل نمبر:



او جھل خاکے

یہ چیزیں خاکے میں چھپی ہوئی ہیں۔ آپ ان چیزوں کو تلاش کیجئے اور شاباش لیجئے۔





بارش سے بچنے کے لیے درخت کے نیچے کیوں کھڑا

نہیں ہونا چاہیے؟

آسمانی بجلی درخت پر گرنے سے درخت ٹوٹ کر گر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس درخت کے نیچے کھڑا ہوگا تو وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔



برف کا آدمی دیر سے کیوں پگھلتا ہے؟

برفانی علاقوں کے لوگ نرم برف کو دبا دبا کر برف کا آدمی بناتے ہیں۔ دبانے سے برف سخت ہو جاتی ہے۔ برف سورج کی روشنی اور حرارت کو منعکس کرتی ہے۔ رات کے وقت درجہ حرارت میں کمی سے بھی برف جمی رہتی ہے۔ اس سے برف کا آدمی کچھ دنوں تک پگھلتا نہیں۔



بجلی کیوں گرتی ہے؟

آسمانی بجلی ایک بہت بڑی چنگاری ہوتی ہے۔ جب یہ چمکتی ہے تو زمین کی کشش اسے اپنی طرف کھینچتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔



بادل کیوں گرجتے ہیں؟

جب بجلی چمکتی ہے تو اس کی تیز حرارت سے ارد گرد کی ہوا نہایت تیزی سے پھیلتی ہے جس سے خوف ناک دھماکا ہوتا ہے۔ اسے بادل کی گرج کہتے ہیں۔



چمک کے ساتھ گرج کیوں سنائی نہیں دیتی؟

بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک ایک ساتھ پیدا ہوتی ہے لیکن بادلوں میں روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے بہت زیادہ ہے، اس لیے پہلے بجلی کی چمک نظر آتی ہے اور بعد میں گرج سنائی دیتی ہے۔



ت	ل	ط	ر	ب	م	غ	ی	پ	ش
ا	ع	س	ج	د	ه	ص	ے	ڈ	چ
ص	ف	ه	گ	و	ی	ب	ا	ع	ه
ب	ٹ	ز	ه	ر	م	ع	ذ	خ	ژ
ر	ء	و	ش	ی	ن	ٹ	ا	پ	گ
ف	ڑ	ر	ط	ع	ص	ث	ن	ح	ن
چ	ے	ٹ	ا	س	ف	ر	ش	ت	ے
ز	ا	م	ن	و	ظ	ق	ء	ص	ف
ث	ل	س	ا	ی	م	ا	ن	م	ڈ
ک	پ	ج	ق	ع	و	ک	ر	ش	ٹ

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں۔

اذان، نماز، سجدہ، روزہ، رکوع، فرشتے، عمرہ، پیغمبر، ایمان، صبر



انتقام کی بار

آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں نے سلیم کو واپس مڑنے پر مجبور کر دیا۔ وہ تیزی سے اس گھر سے نکل آیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ گاڑی چلاتے ہوئے وہ سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ اسے اپنے آپ سے ایک وحشت سی ہونے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

سلیم کو یقین تھا کہ اس کے دوست اسے جیل سے نکال لیں گے۔ آخر اس نے بھی تو ان کی اکثر مدد کی تھی۔ اس کا بزنس جن بدعنوانیوں اور رشوت خوروں کا شکار تھا، اس کی وجہ سے اسے جیل ہو گئی تھی مگر وہ انتظار کرتا رہا اور کوئی اس کی مدد نہ آیا۔ اسے عمر قید کی سزا ہو گئی۔ جس بزنس پر اسے فخر تھا وہ مکمل طور پر ڈوب چکا تھا۔ اب اسے صرف اپنے اکلوتے ایک سالہ بیٹے کی فکر کھائے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس معصوم بچے کو دیکھتے ہی آمنہ کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بچپن جو انتقام کے زہر سے داغ دار کر دیا گیا تھا۔ اب وہ ایک اور بچپن انتقام کی نذر نہیں کر سکتی تھی۔ نہیں! وہ ایسا نہیں ہونے دے گی۔ ”آپ کون ہیں؟“ بچے نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بار بار اپنی ماں جی کا آنسوؤں بھرا چہرہ آ رہا تھا مگر اس وقت اس پر غصہ غالب تھا، اس لیے اسے ندامت محسوس نہ ہوئی۔ بے شک ماں جی نے اسے بے تحاشا پیار و محبت دی مگر وہ اس کی حقیقی ماں نہیں تھی۔ آج یہ حقیقت معلوم ہونے پر اس کے سینے میں ایک آگ بھڑک اٹھی تھی۔ ماں جی اسے بلاتی رہ گئی تھیں مگر وہ غصے میں بھرا گھر سے نکل آیا تھا اور اب اس کی گاڑی پولیس اسٹیشن کی سمت دوڑی جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“ رب نواز کی آنکھوں سے خوف صاف ظاہر تھا۔

”ہا ہا ہا!“ سلیم نے ایک مکروہ قہقہہ لگایا۔ ”تمہاری کمپنی میرے بزنس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ تمہارے ختم ہوتے ہی تمہاری کمپنی ٹھپ ہو جائے گی اور میری زندگی آسان!“

بے آواز پستول کے چند فائر رب نواز اور اس کی بیوی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر گئے۔ سلیم کی نظر رب نواز کی اکلوتی بیٹی پر پڑی جو پردوں کے درمیان ساکت کھڑی یہ خوف ناک منظر دیکھ رہی تھی۔ سلیم کا پستول اس کی جانب اٹھا، مگر ناجانے کیوں اس معصوم

”تمہاری امی!“ آمنہ کے منہ سے نکلا۔

”میری امی؟؟“ بچے کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی۔

بچے کی آیا نے کچھ کہنے کے لیے سر اٹھایا مگر آمنہ نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

”اب تم میرے ساتھ رہو گے!“ اس نے بچے کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ اس کی خوشی سے چمکتی ہوئی آنکھیں آمنہ کے چہرے پر مسکراہٹ لے آئیں اور اس کا دل پرسکون ہو گیا، مگر ایک اور کام کرنا ابھی باقی تھا۔ اس نے فوراً پولیس اسٹیشن کی راہ لی۔

”تو آپ اپنا فیصلہ واپس لینا چاہتی ہیں؟“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

”جی ہاں!“ آمنہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

”اس سلسلے میں کسی نے آپ کو مجبور تو نہیں کیا؟“ انسپکٹر جمشید مکمل تسلی کرنا چاہتے تھے۔

”نہیں، یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔“ آمنہ نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، اب ملزم کو پھانسی نہیں دی جائے گی لیکن عمر قید کی سزا برقرار رہے گی۔“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید آمنہ کو رخصت کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔

جانے سے پہلے میں ملزم سے ملنا چاہوں گی۔“ آمنہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟“ انسپکٹر نے حیرانگی اور تجسس سے پوچھا۔

”یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔“ آمنہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆.....☆.....☆

وہ پولیس اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ اس کے پاس تمام کاغذات تھے چنانچہ مطلوبہ جیل تک پہنچنے میں اسے کوئی مشکل درپیش نہ آئی۔ جلد وہ اس شخص کے پاس پہنچ چکا تھا جس سے وہ ملنے آیا تھا۔ جیل کا دروازہ کھولا گیا اور وہ اندر داخل ہو گیا۔ اس کے روبرو ایک بوڑھا آدمی تھا جس کے سر اور ڈاڑھی کے تمام بال سفید ہو چکے تھے۔ اسے دیکھتے ہی بوڑھا کھڑا ہو گیا۔

”تم..... تم کون ہو؟“ اس نے آنے والے سے گھبرا کر پوچھا۔

”ابو! میں آپ کا بیٹا ہوں..... آپ کا بیٹا ذیشان!“ اس نے

بوڑھے کو جواب دیا۔

”میرا بیٹا.....“ یہ سن کر بوڑھے سلیم کی آنکھیں حیرت سے

پھیل گئیں۔ اسے لگا کہ جیل میں بیس سال گزارنے کے بعد وہ

پاگل ہو گیا ہے۔ ایک لمحے کو وہ ساکت رہ گیا مگر پھر اسے بیس سال پہلے کے واقعات یاد آ گئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ واقعی اس کا بیٹا ذیشان تھا۔

”آپ رو کیوں رہے ہیں؟“ ذیشان کی آواز اُسے ماضی سے واپس کھینچ لائی۔

”کیا آپ کو مجھ سے مل کر خوشی نہیں ہوئی؟“ ذیشان نے بے چینی سے پوچھا۔

”نہیں بیٹے! مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ آج مجھے وہ سکون مل گیا ہے جس کی مجھے ساری عمر تلاش تھی اور جسے میں غافلوں کی طرح دولت کے انباروں اور سگریٹ کے دھوئیں میں تلاش کرتا رہا تھا۔“ سلیم نے ماضی میں کھوئے ہوئے کہا۔

”ابو آپ جیل میں کیوں ہیں؟“ ذیشان نے آہستہ سے پوچھا۔

”سلیم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کہا۔ ”اپنے گناہوں کی وجہ سے۔“

”کیسے گناہ؟“ ذیشان نے بے چینی سے پوچھا۔

”سلیم چند لمحے خاموش رہا اور پھر جواب دینے کی بجائے ذیشان سے سوال کیا۔ ”تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”آپ سے ملنے!“ ذیشان نے جواب دیا۔

”کیوں؟“ سلیم نے پوچھا۔

”کیونکہ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ جسے میں ساری زندگی ماں سمجھتا رہا وہ میری حقیقی ماں نہیں۔ میں بے چین ہو گیا اور اپنے حقیقی خونی رشتے سے ملنے چلا آیا۔ اب میں کبھی واپس نہیں جاؤں گا!“ ذیشان نے تلخ لہجے میں کہا۔

”نہیں بیٹا! ایسے مت کہو! وہ تو شاید تمہاری حقیقی ماں سے بھی بڑھ کر ہیں۔“ سلیم نے فوراً کہا۔

”کیا مطلب؟ آپ انہیں جانتے ہیں؟“ ذیشان نے حیرت سے اپنے والد کو تکتے ہوئے پوچھا۔

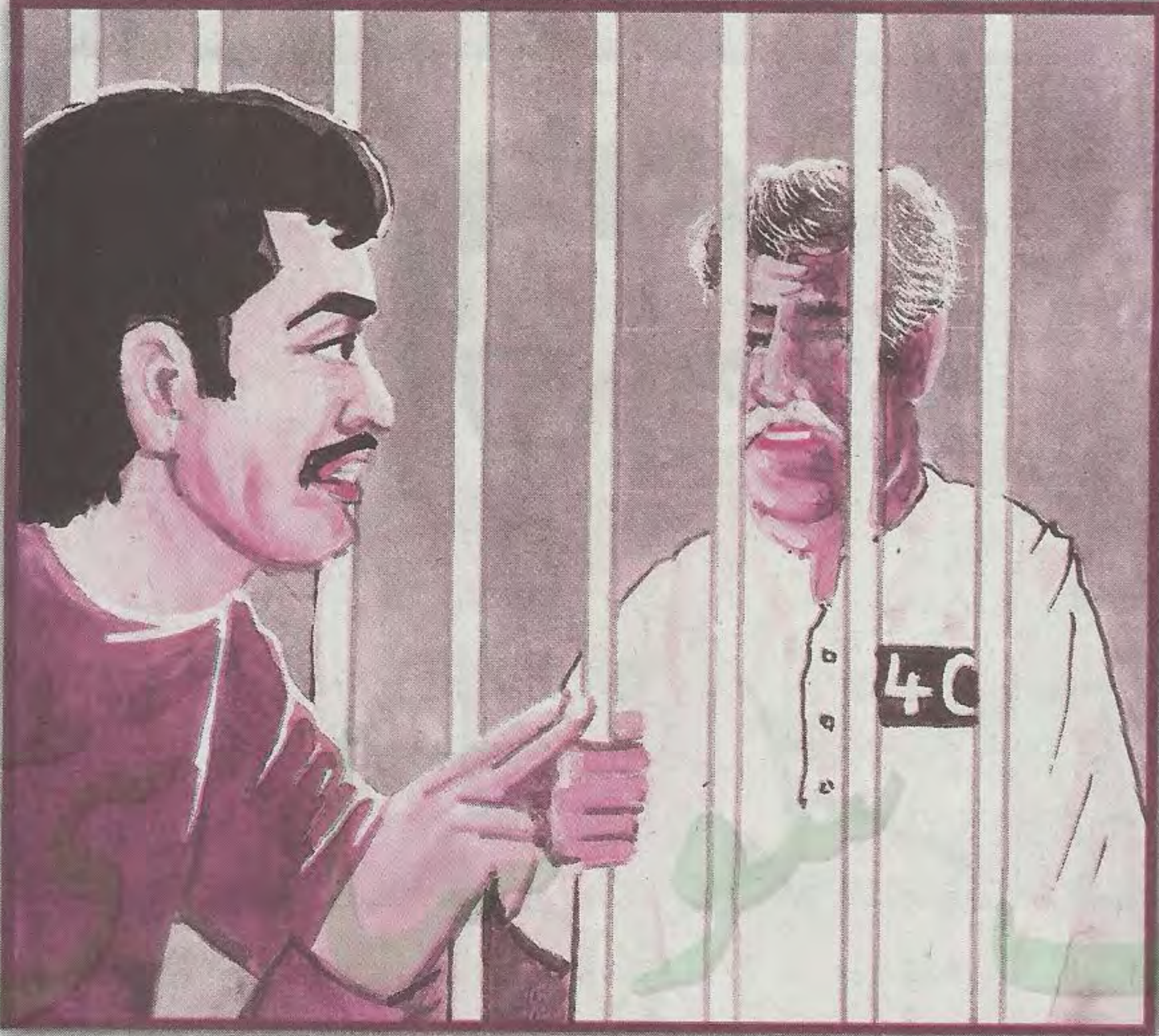
چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سلیم نے کہنا شروع کیا۔ ”میں

ایک بہت بڑا بزنس مین تھا جسے اپنی دولت، شہرت اور کاروبار پر بے حد غرور تھا۔ میں نے دولت ہمیشہ غلط طریقے سے حاصل کی۔

میری کمپنی کے مقابلے میں جو کمپنی تھی اس نے باہر ملک کی ایک

بڑی کمپنی سے معاہدہ کر لیا جو میری کمپنی کرنا چاہتی تھی۔ اس سے

میری کمپنی کی شہرت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ چنانچہ انتقام کی آگ



میں بھڑکتے ہوئے میں
نے کمپنی کے مالک اور
اس کی بیوی کو قتل کر
دیا.....“ سلیم سانس لینے
کے لیے رُکا۔ اس نے
ذیشان کی طرف دیکھا۔
اس کی آنکھیں خوف سے
پھیل چکی تھیں اور وہ بت
بنا سب کچھ سن رہا تھا۔
سلیم نے پھر کہنا
شروع کیا۔ ”اس بزنس
میں کی صرف ایک بیٹی تھی
جسے میں نے اس
بھیانک رات کو زندہ
چھوڑ دیا تھا۔ تم اس وقت

مانگی۔ اس نے مجھے معاف کر دیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ تمہیں حقیقی
ماں جیسا پیار دے گی اور معاشرے کا ذمہ دار اور عزت دار شہری
بنائے گی۔ میں اس کا بہت ممنون ہوں کیوں کہ اس نے اپنے
وعدے کا پاس کیا۔ میں اس کے ماں باپ کا قاتل تھا لیکن اس نے
مجھ پر احسان کیا اور میرے بیٹے کی ماں جیسی پرورش کی۔ گناہوں
نے میرا سکون چھین لیا تھا مگر آج تمہیں خوش حال دیکھ کر وہ سکون
لوٹ آیا ہے۔ اگر وہ لڑکی نفرت کو نفرت سے ختم کرتی تو ختم ہونے
کی بجائے بڑھ جاتی مگر اس نے نفرت کو محبت سے ہمیشہ کے لیے
ختم کر دیا۔“ یہاں تک کہہ کر سلیم خاموش ہو گیا۔

اس نے ذیشان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے
تر تھیں۔ ہچکیوں کی آواز نے انہیں کمرے میں ایک اور موجودگی کا
احساس دلایا۔ آمنہ جیل کے دروازے میں کھڑی ہچکیاں لے رہی
تھیں۔ بلب کی روشنی میں اس کا چہرہ آنسوؤں سے چمکتا دکھائی دے
رہا تھا۔ ذیشان اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گیا اور بلک بلک کر
رونے لگا۔ انتقام ہار گیا اور رحم دلی نے جگہ لے لی، جس نے ایک
انسان کو برائیوں سے بچا لیا تھا تاکہ وہ ایک اچھا انسان بن سکے۔

☆.....☆.....☆

صرف ایک سال کے تھے۔ تمہاری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔
رشتہ خوریوں کی وجہ سے مجھے جیل ہو گئی۔ جن پر مجھے بھروسہ تھا وہ
میری دولت لے اڑے اور میرا کاروبار تباہ ہو گیا۔ مجھے عمر قید کی
سزا ہو گئی۔ بہت منت سماجت کے بعد میں نے تمہارے لیے آیا کا
بندوبست کیا اور جتنی جمع پونجی تھی، تمہاری پرورش کے لیے وقف کر
دی۔ یوں پانچ سال جیل میں بے سکونی کی حالت میں گزر
گئے۔ اس بزنس میں کی بیٹی مجھ سے انتقام لینے آگئی اور میری
پھانسی کی درخواست دے دی۔ مجھے تمہارے یتیم ہو جانے کا خوف
تھا، جس طرح اس رات میں نے رب نواز کو قتل کرنے سے پہلے
اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ میرے بعد تمہارا کیا بنتا۔ تم بھی میری
طرح گناہوں کی دلدل میں دھنس جاتے، مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور
تھا۔ اس لڑکی کو معلوم ہوا کہ میرا ایک پانچ سالہ بیٹا ہے۔ انتقام کی
جگہ اس کے دل میں رحم نے لے لی۔ انتقام ہار گیا اور اس نے
تمہیں گود لے لیا اور میری پھانسی کی درخواست واپس لے لی۔ اس
کے اس فیصلے سے میں حیران رہ گیا اور مجھے اپنے کیے پر شدید
ندامت ہوئی۔ مجھ جیسے قاتل اور خود غرض پر وہ رحم کھا رہی تھی۔ وہ
مجھ سے ملنے جیل آئی۔ میں نے اس کے پاؤں پڑ کر اس سے معافی

سنہرے لوگ

غلام حسین میمن



صدیق ساک

سے پڑنے والے آبلے اسے
تھکاتے۔ عمر کے ابتدائی حصے
میں ہی اسے احساس ہو چکا
تھا کہ گھر کی غربت دور
کرنے کا واحد طریقہ یہی
ہے کہ وہ تعلیم حاصل
کرے۔ وہ یہ جان چکا تھا
کہ علم ہی دراصل وہ چابی
ہے جس سے کامیابی کا ہر
دروازہ کھولا جاسکتا ہے۔ وہ
حصولِ علم میں دوڑتا ہی رہا۔
اسکول کی تعلیم ختم ہوئی تو وہ
اسلامیہ کالج لاہور میں
داخل ہوا۔ دن کو تعلیم اور
رات کو ملازمت کر کے وہ
تعلیمی اخراجات پورے کرتا
رہا۔ اس نے انگریزی
ادب میں ماسٹر کی سند
حاصل کی اور پھر پنجاب
یونیورسٹی سے بین الاقوامی

تعلقات عامہ میں ڈپلومہ کیا۔

تعلیم سے فراغت کے بعد اب اس کے ہاتھ میں وہ چابی آ
گئی جس سے وہ اپنے لیے زندگی میں کامیابی حاصل کر سکے اور یہی
ہوا۔ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی اس پر دروازے کھلنے لگے۔ پہلی
ملازمت اسے مانسہرہ کے ایک کالج میں بطور لیکچرار کے ملی۔ اس
نے یہاں چار سال تک طلباء کو انگریزی ادب سے روشناس کرایا۔
1964ء میں اس نے پاک فوج کے ایک اشتہار کے جواب
میں درخواست بھجوائی۔ کچھن مراحل سے گزرنے کے بعد وہ پاک فوج
کا ایک حصہ بن گیا۔ تین سال کی عمر میں یتیمی کا داغ سہنے والا یہ بچہ
آج کمیشن حاصل کر کے کیپٹن بن چکا تھا۔ یہ شخصیت ادب اور پاک

تین سال کی عمر میں اس نے یتیمی کا داغ دیکھا۔ اب اس کی
ذکیر بھال کی پوری ذمہ داری اس کی والدہ نبھار رہی تھی۔ گاؤں سے
چار میل دور اسکول تھا۔ روز چار میل پیدل چل کر اسکول جانا اور
دوبارہ ان ہی قدموں پر آنا اس کا معمول تھا۔ اکثر وہ ننگے پیر ہی
ہوتا، کیوں کہ اس کی والدہ کے پاس جوتے کے لیے پیسے بھی نہیں
ہوتے تھے۔ ناشتہ بھی کبھی ملتا اور کبھی نہیں۔ ماں کی سب سے بڑی
خواہش یہی تھی کہ میرا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے تاکہ اسے معاشرے
میں اچھا مقام ملے۔

اس کے سر پر بھی تعلیم حاصل کرنے کی ایسی دھن سوار تھی کہ
اسے نہ راستے کی دھوپ جھلساتی اور نہ ہی دھوپ میں ننگے پیر کی وجہ

برداشت کا امتحان لیتے تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ

ہماری ڈھال بن جاتے۔“

اور پھر دو سال کی سیاہ رات ختم ہوئی۔ 1973ء میں وہ وطن

واپس آئے۔ یہاں ایک اور صدمہ ان کا منتظر تھا۔ باپ کی شفقت

سے تو وہ تین سال کی عمر میں ہی محروم ہو چکے تھے۔ اب ماں بھی

نہیں رہی۔ بچپن سے وہ اور ماں ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ آج

وہ سہارا ان کا ساتھ چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ سیدھے قبرستان گئے اور

ماں کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر آنسو بہاتے رہے۔

صدیق سالک نے اپنے ان قید کے کرناک لحاظ کو کتاب

”ہمہ یاراں دوزخ“ میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کو انہوں نے

اپنی ماں کے نام معنون (Dedicate) (منسوب کرنا) کیا ہے۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں انہوں نے دو اور کتابیں بھی

تحریر کی ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں۔ پہلی کتاب ”میں نے ڈھاکہ

ڈوبتے دیکھا“ اور دوسری انگریزی میں ”Witness to

surrender“ ہے۔

1997ء میں وہ لیفٹیننٹ کرنل ہے اور بعد میں انہیں چیف

آف آدمی سٹاف اور صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق کی تقاریر لکھنے

کا فریضہ سونپا گیا۔ 1985ء میں وہ بریگیڈیئر بنائے گئے۔ اس

دوران ان کے دو ناول ”ایمر جنسی“ اور ”پریشر ککر“ کے علاوہ

مضامین کا مجموعہ ”تادم تحریر“ منظر عام پر آئے۔

1988ء میں وزیراعظم محمد خان جونیجو کی برطرفی کے علاوہ

سانحہ اوچھڑی کیمپ جسے حادثات پیش آئے۔ اس کے بعد ان کا دل

ملازمت سے اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے چیف سے فوج کی ملازمت

چھوڑنے کی اجازت مانگی مگر جواب ملا: ”دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔“

17 اگست 1988ء کو وہ اپنے چیف جنرل محمد ضیاء الحق کے

ہمراہ بہاول پور کے سفر میں تھے کہ طیارہ حادثے میں تباہ ہو گیا۔ وہ

اپنے فرائض کی بجا آوری کرتے ہوئے شہادت کے مرتبے پر فائز

ہو گئے۔ شہادت کے بعد ان کی خودنوشت ”سیلوٹ“ شائع ہوئی۔

ان کی زندگی مسلسل جدوجہد سے پُر ہے۔ ان کے بعد ان

کے صاحبزادے سرد سالک پاک فوج کا حصہ ہیں۔ ☆☆☆

فوج کے حوالے سے شہرت پانے والے صدیق سالک کی ہے۔

انگریزی ادب میں ایم اے کرنے کی بناء پر انھیں پاک فوج

کے شعبے آئی ایس پی آر (Inter Services Public

Relation) سے منسلک کر دیا گیا۔ یہ فوج کا وہ شعبہ ہے جس کا

مقصد افواج پاکستان اور عوام میں معلومات اور اعتماد کا رشتہ قائم

رکھنا ہوتا ہے تاکہ مشکل وقت آنے پر عوام اپنی فوج کی پشت پر

موجود رہے۔

جنوری 1970ء میں صدیق سالک میجر بنائے گئے اور ان

کی تقرری مشرقی پاکستان میں ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب سازشی

عناصر ملک میں ابتری پھیلا رہے تھے..... اور پھر اپنوں اور غیروں

کی سازشیں کامیاب ہوئیں۔ 16 دسمبر 1971ء کو مشرقی پاکستان کا

خوب صورت اور شاداب ترین علاقہ ”بنگلہ دیش“ کے نام سے علیحدہ

ملک بن گیا۔ ہم سے ہمارا بازو الگ ہو گیا۔ یہ ہمارے پیارے

وطن کے لیے ایک بڑا سانحہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے اعلان کے

بعد دنیا کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے طور پر پاکستان دنیا

کے نقشے پر ابھرا تھا..... اور آج ہم یہ اعزاز کھو چکے تھے۔

ہماری اس شکست کے پیچھے بھارت کا ہاتھ تھا۔ پاک فوج کے

جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے اور ہمارے نوے ہزار فوجی

بھارت کی قید میں چلے گئے۔ ان قیدیوں میں میجر صدیق سالک

بھی شامل تھے۔ چوں کہ ان کا تعلق پاک فوج کے خاص محکمے

”ISPR“ سے تھا، اس لیے ان پر تشدد کا انداز خاص اور تکلیف کا

عذاب زیادہ تھا۔ وہ دو سال فورٹ ولیم کالج، کلکتہ کی ایک بیرک میں

قید رہے۔ جنگی قیدیوں کو عام قیدی سے زیادہ عذاب بھگتنا پڑتا ہے۔

یہی سلوک ہمارے فوجیوں کے ساتھ بھی ہوا۔ اپنے دکھ بھرے لحاظ

کو انہوں نے اپنی آپ بیتی ”سیلوٹ“ میں یوں بیان کیا ہے۔

”میں نے جو عرصہ وہاں گزارا، اللہ تعالیٰ دشمن کو بھی نہ

دکھائے۔ ایک مہینے میں میرا وزن پچاس پونڈ کم ہو گیا۔ ہم

مسلمانوں کا ایک بڑا اثاثہ ہمارا ایمان ہے جو ایسے وقت میں

سہارا بنتا ہے۔ تاریک و خاموش اور خنک رات کو تین چار

مشنڈے ہنٹر لے کر سیل میں آئے..... اور ہر قیدی کی قوت



معلومات عامہ

- تھامس کارلائل کا نبیؑ پر خطبہ اردو زبان میں بطل نبوت کے نام سے شائع ہوا۔
- ”صبح اُحد“ ناول کی صورت میں ایم اسلم نے لکھی۔
- عیسائیوں کے نقطہ نظر کی ترجمان کتاب ”محمد عربیؐ“ برکت اللہ پادری کی تحریر ہے۔
- ”رسول عربیؐ“ کے غیر مسلم مصنف گوردیت سنگھ دارا تھے۔
- پیغمبر صحر اُ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔
- علامہ راشد الخیر نے خاص طور پر عورتوں کے لیے سیرت پاکؐ پر آمنہ کا لال کتاب لکھی۔ (گل ریز، لاہور)
- لیکچو میٹر آلے سے دودھ کی کثافت معلوم کی جاتی ہے۔
- سمندر میں سمت معلوم کرنے کے لیے جیو میٹر استعمال ہوتا ہے۔
- الٹی میٹر سے بلندی ناپی جاتی ہے۔
- سب سے پہلے تھرماسٹر گلیلیو نے ایجاد کیا۔
- سینٹی گریڈ تھرماسٹر ایڈون سینس نے ایجاد کیا۔
- اسٹیمو میٹر سے ہوا کی رفتار ناپی جاتی ہے۔
- بھاپ کی حرارت مخفی 537 کیلوری ہے۔
- برف کی حرارت مخفی 80 کیلوری ہے۔
- تانبا اور لوہا ملانے سے کانسی بنتی ہے۔
- نائٹرس آکسائیڈ گیس کا اصل نام (Laughing Gas) ہے۔
- بھاری پانی 214.66 درجہ حرارت پر ابلنے لگتا ہے۔
- خلاء میں آنکھ سے دکھائی نہ دینے والی شعاعوں کو کاسمک ریز کہا جاتا ہے۔
- روشنی کی چمک کی اکائی کا نام لیومن ہے۔
- سمندر کے پانی میں سب سے اہم دھات میکینیشیم ملتی ہے۔
- (شرہ ندیم، ملتان)
- امریکہ میں اسکوائش کی گیم 15 پوائنٹس کی ہوتی ہے۔
- اسکوائش میں 9 پوائنٹ جیت کر کھلاڑی فتح یاب ہوتا ہے۔
- اسکوائش کے گیند کی شکل وساخت بیڈمنٹن کے گیند جیسی ہوتی ہے۔
- اسکوائش کا کھیل 2 کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاتا ہے۔
- اسکوائش کے کھیل کی ابتداء انگلینڈ سے ہوئی۔
- اسکوائش کے کھیل کی ابتداء 1870ء سے ہوئی۔
- اسکوائش کا جادوگر کھلاڑی ہاشم خان کو کہا جاتا ہے۔
- اسکوائش کی پہلی خاتون چیمپئن نبیلہ نعیم تھیں۔
- (در شہوار، کوئٹہ)
- ابلیس شیطان کا اسم ذات عبرانی زبان کا لفظ ہے مگر عرب اسے بلس کہتے ہیں جس کا مطلب ہے ناامید ہونا۔
- برزخ، عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی رکاوٹ اور فاصلہ کے ہیں۔ یعنی وہ عالم جس میں روح، موت سے لے کر قیامت کے دن تک رہے گی۔
- خط سبز جو بیروت و لبنان کے مسلمان اور عیسائی سیکڑوں میں تقسیم کرنے والا خط 1983ء میں کھینچا گیا۔
- خط منحنی ایسا خط جس کی شکل منحنی سے ملتی جلتی ہے۔ یہ قدیم فارسی کا رسم الخط ہے۔ قدیم زمانے میں لکڑی کی کیل سے منحنی کی تختیوں پر تحریر نقش کیے جاتے تھے۔
- خطوط ہم بار (Iso Bars)، آئسو کا مطلب مساوی اور بار کا مطلب دباؤ ہے۔ نقشوں پر یکساں ہوا کے دباؤ والے مقامات کو ان خطوط کے ذریعے ملا دیا جاتا ہے۔
- فکر اقبال انگریز مستشرق پروفیسر نکلسن نے علامہ اقبال کو مغرب میں متعارف کرایا۔
- پروفیسر آربری نے علامہ اقبال کی کتابوں کا انگریزی ترجمہ کیا۔
- پروفیسر یوزانی نے اطالوی زبان میں علامہ اقبال پر کام کیا۔
- اقبال شناسی میں روس میں این میری شمل نے نام پیدا کیا۔
- دریائے نیکر کے کنارے علامہ اقبال کی مشہور نظم ”دریا کا کنارہ“ پتھر پر کندہ ہے۔
- (سامعہ شہزادی، لاہور)

میری زندگی کے مقاصد



انم افتخار، کراچی
میں مصورہ بن کر ماں باپ کا نام
روشن کروں گی۔



سنیہ جاوید، سیالکوٹ
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج
کروں گی۔



محمد حظلہ، بنجول کینٹ
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کا نام
روشن کروں گا۔



حامد علی، جوہر آباد
میں انجینئر بن کر ماں باپ کا نام
روشن کروں گا۔



ایضہ فجر، میرپور آزاد کشمیر
میں فوج میں جا کر ملک و قوم کی
خدمت کروں گی۔



انیس الرحمان، گوجرانوالہ
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن
کروں گا۔



محمد شاہد، لاہور
اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے خلا باز بنوں
گا۔



علی طاہر، لاہور
میں فوج میں جا کر ملک کی حفاظت
کروں گا۔



عدیل امجد، جہلم
میں دین اسلام کی روشنی پھیلاؤں
گا۔



محمد عبداللہ سلطان، سرگودھا
میں ایک اچھا انسان اور ڈاکٹر بن کر
انسانی جان بچانا چاہتا ہوں۔



محمد عرفان اقبال، دنیا پور
میں اپنے والدین کو جگہ کر دوں گا اور
نیکی کے کام کروں گا۔



طیب خالد، لاہور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ملک و
قوم کی خدمت کروں گا۔



عاشتہ شہزادہ، پشاور
میں بڑی ہو کر استانی بنوں گی۔



رمانہ سعید، گوجرانوالہ
میں ڈاکٹر بنوں گی اور دیکھی انسانیت
کی خدمت کروں گی۔



منیب احمد، واہ کینٹ
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور ماں
باپ کا نام روشن کروں گا۔



اسامہ ظفر راجہ، جہلم
میں بڑا ہو کر راشد منہاس جیسا
کارنامہ سر انجام دینا چاہتا ہوں۔



ثانیہ نضب، چوئیاں
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج
کروں گی۔



ماہ نور راشد، گوجرانوالہ
میں استانی بن کر قوم کو سنوارنا چاہتی
ہوں۔



علی رضا، واہ کینٹ
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بن کر لوگوں کا
مفت علاج کروں گا۔



محمد تیمور ذوالفقار، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی ترقی
میں حصہ لوں گا۔



حسنہ نوال، ملتان
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی۔



حافظ عزیز، ڈی آئی خان
میں وزیراعظم بن کر ملک کی خدمت
کرنا چاہتی ہوں۔



ریحان حنیف، کراچی
میں بڑا ہو کر آرمی جوائن کروں گا۔



عاصمہ اشرف، ملتان
میں ڈاکٹر بن کر غریبوں کا مفت علاج
کروں گی۔



محمد اسماعیل خان، لاہور
میں سافٹ ویئر انجینئر بنوں گا اور
ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔

پاگل نے جواب دیا: جناب اس لیے کہ آپ بالکل ہم ہی جیسے ہیں۔

(افراء خان، صادق آباد)

☆☆

چور کسی کے گھر کا تالا توڑ رہا تھا اتنے میں آہٹ ہوئی، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مالک مکان کھڑا تھا۔ چور بڑا گھبرایا، مگر مالک مکان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ گھبراؤ نہیں، میں تمہارا شکر گزار ہوں کیوں کہ اس تالے کی چابی کہیں کھو گئی تھی۔



استاد (شاگرد سے): کرکٹ کا بلاکس کام آتا ہے؟
شاگرد: کپڑے دھونے کے۔

استاد (شاگرد سے): بتاؤ زمین اور چاند کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟
شاگرد: بہن بھائی کا جناب۔

استاد: وہ کیسے؟

شاگرد: کیوں کہ چاند کو سب ماموں کہتے ہیں جب کہ زمین کو ماں کہتے ہیں، اس لیے یہ دونوں بہن بھائی ہوئے۔

(سمیچہ شاہد، لاہور)

☆☆

(محمد حبیب الرحمن صدیقی، اسلام آباد)

☆☆

میاں (بیوی سے): تم ایک گھنٹے سے دروازے پر کھڑی کس سے باتیں کر رہی تھی؟

بیوی: وہ میری دوست تھی؟ بیچاری کے پاس اندر آنے کا ٹائم ہی نہیں تھا۔

نچ (چور سے): دروازے پر پیروں کے نشان سے پتا چلتا ہے کہ تم نے کمرے کے اندر گھس کر چوری کی۔

چور (غصے سے): یہ غلط ہے۔ میں تو کھڑکی کے راستے اندر گیا تھا۔

(گل ناز زبیر، ایبٹ آباد)

☆☆

نچ (ملزم کو سزا سناتے ہوئے): تین ماہ قید۔ آئندہ تمہیں اس عدالت میں نہ دیکھوں۔

ملزم: کیوں؟ کیا حضور کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ (اشرف تواب، راول پنڈی)

☆☆

استاد: (شاگرد سے) سرگرم کو جملے میں استعمال کرو۔

شاگرد: ننگے سر پھرنے سے گرمی میں سرگرم ہو جاتا ہے۔

(ثنا منیر، کوئٹہ)

سیاح (ملاح سے): یہاں بڑی بڑی مچھلیاں تو نہیں ہیں۔
ملاح: بے فکر ہو کر نہائیں جناب! بڑی چھوٹی مچھلیوں کو مگر مجھ ختم کر چکے ہیں۔

باہی (اخبار پڑھتے ہوئے): بدین میں ایک پاگل شخص کنویں میں گر کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

منا (معصومیت سے): اگر کنویں میں گرا ہی تھا تو پانی سے ہاتھ دھو لیتا جان سے ہاتھ کیوں دھوئے۔
(ثریا عبدالستار انصاری، لاہور)

☆☆

باپ نے حیران ہو کر بیٹے سے پوچھا: تم مرغا کیوں بنے ہوئے ہو؟
بیٹا: ابا جان! آپ نے تو کہا تھا کہ اسکول میں جو کام دیا جاتا ہے، اسے گھر پر بھی دہرایا کرو۔
(عائشہ جموعہ، پنڈ دادن خان)

☆☆

ایک پاگل نے ڈاکٹر سے کہا: ہم آپ کو پہلے والے ڈاکٹر سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نے سوال کیا (بڑے خوش ہو کر): وہ کیوں اور مجھ میں کیا خصوصیت ہے؟

لو جھوٹو جانیں



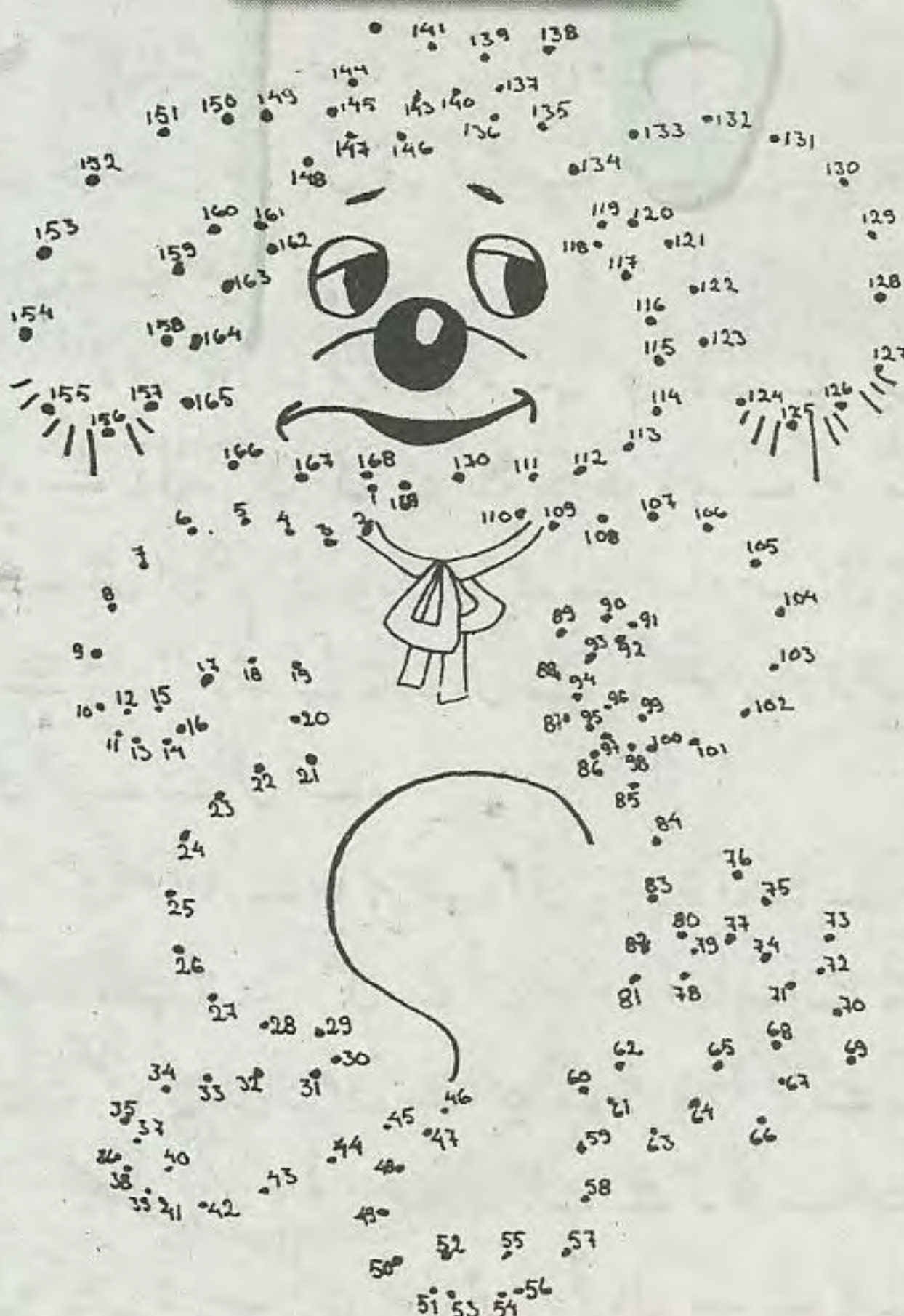
پیڑوں کی اونچی شاخوں کے
پتے کھاؤں خوب مزے سے
4- چھوٹا سا مٹکا ٹوٹ نہ جائے
دو رنگا پانی پھیل نہ جائے
ٹوٹ گیا تو جڑ نہ پائے
پھیل گیا تو خود ہی کھائے
(عالیہ عارف، ڈجکٹ)

5- میٹھا پانی اور پھول ملے گا
کھینچو بال تو خوب ملے گا
مارو اس کو اری شادو
یہ تو ہے بنگال کا جادو
6- ایک گاڑی کے بارہ ڈبے
ہر ڈبے میں تیس مسافر
(صبا ممتاز، کراچی)

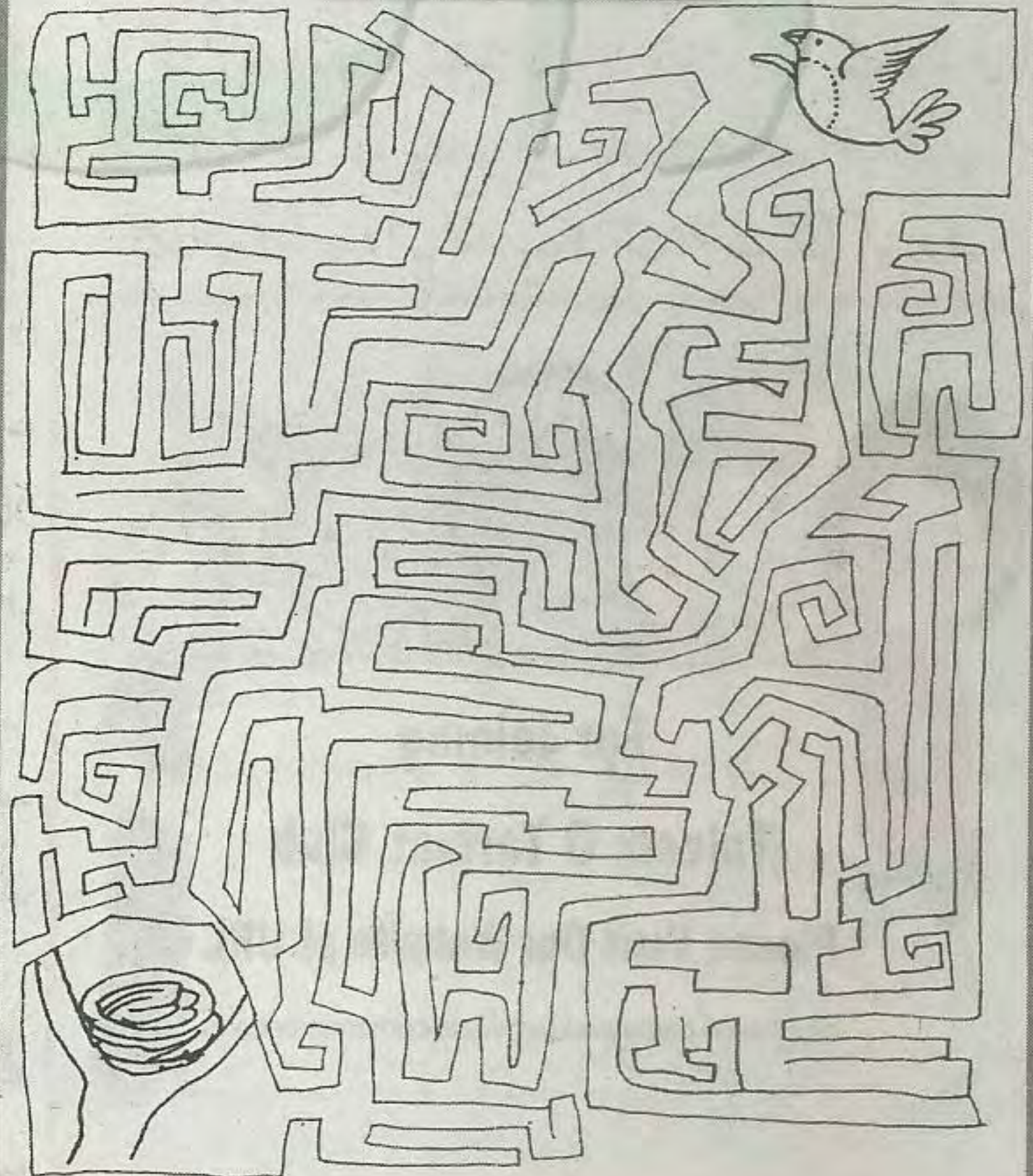
1- نیچے پکڑو اوپر آتی
اوپر سے پھر نیچے آتی
اونچی اونچی کود لگاتی
گول گول ہوں تم کو بھاتی
2- ایک تھال ہیروں سے بھرا
سب کے سر پر اوندھا دھرا
موتی اس سے ایک نہ گرے
آنکھ کھلی تو ہیرے غائب
3- میری گردن اونٹ کے جیسی
خوب ہیں میری ٹانگیں لمبی
منہ ہے میرا ہرن کے جیسا
جنگل کے اندر ہوں رہتا

جوانہ: 1- کتہ 2- رات 3- زباز
4- اٹھا 5- اتر 6- سہا 7- تہ

مذہبے ملائیں



راستہ ڈھونڈیے



ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا

لیس؟“ سلمیٰ نے شوہر کی پوری بات سننے سے پہلے ہی انکار میں ہاتھ لہرایا۔ ”نہیں نہیں! ہم اپنا الگ ہی بکرا لے کر قربانی کریں گے۔ یہ ساجھے کی قربانی مجھے نہیں پسند۔“

یہ سن کر ارشد کے ابو بے زاری سے گردن جھٹک کر بولے: ”بس تم بھی بیٹے کی طرح ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ ہی بناؤ گی۔“

جب بڑی آپا نے کہا کہ کوئٹوں کی نیاز مل کر دے دیتے ہیں، تب بھی تم نہ مانیں اور الگ ہی سارا اہتمام کیا۔“ ننھے ارشد کی ایک معصوم حرکت سے یہ محاورہ ایک کہانی کی صورت اختیار کر گیا۔ کیوں بچو! اب تو آپ کو اس محاورے کا اصل مطلب سمجھ آ گیا ہوگا۔

سلمیٰ باورچی خانے سے نکلی تو دیکھا کہ اس کا پانچ سال کا بچہ ارشد صحن کے کونے میں بیٹھا مٹی گوندھ رہا ہے۔ قریب ہی اینٹوں کے دو تین ٹکڑے پڑے ہیں۔ بیٹے کے ہاتھوں اور کپڑوں کو مٹی میں لت پت دیکھ کر وہ چیخی: ”ہائے ہائے! بیٹا یہ کیا کر رہے ہو؟ صبح ہی تمہیں نہلا کر کپڑے بدلے ہیں اور تم نے کپڑے خراب کر لیے ہیں۔“

”امی! میں بھی اپنے گھر کے اس کونے میں مسجد بناؤں گا پھر اس میں نماز پڑھا کروں گا۔“ ارشد نے بھولے پن سے جواب دیا تو ماں کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

”لو اور سنو! صاحبزادے گھر میں مسجد بنانے چلے ہیں۔“ وہ پیار سے بولی۔ ”جی امی! میرے دوست ماجد کے گھر کے ایک کونے میں ان کی اپنی پیاری سی مسجد ہے اور وہ سب اسی میں نماز پڑھتے ہیں۔“ ارشد نے بتایا۔ ماں بیٹے کی گفتگو سن کر ارشد کے ابا بھی کمرے سے نکل آئے۔

”دیکھو تمہارے صاحبزادے اپنی یہ ڈیڑھ اینٹ لے کر الگ مسجد بنا رہے ہیں۔“ سلمیٰ نے ہنس کر شوہر کو بتایا۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میاں فون سننے اندر گئے پھر باہر آ کر کہنے لگے:

”بھائی جان کا فون تھا، کہہ رہے تھے کہ بکرے بہت مہنگے ہیں، کیوں نہ سب بہن بھائی مل کر قربانی کے لیے گائے لے



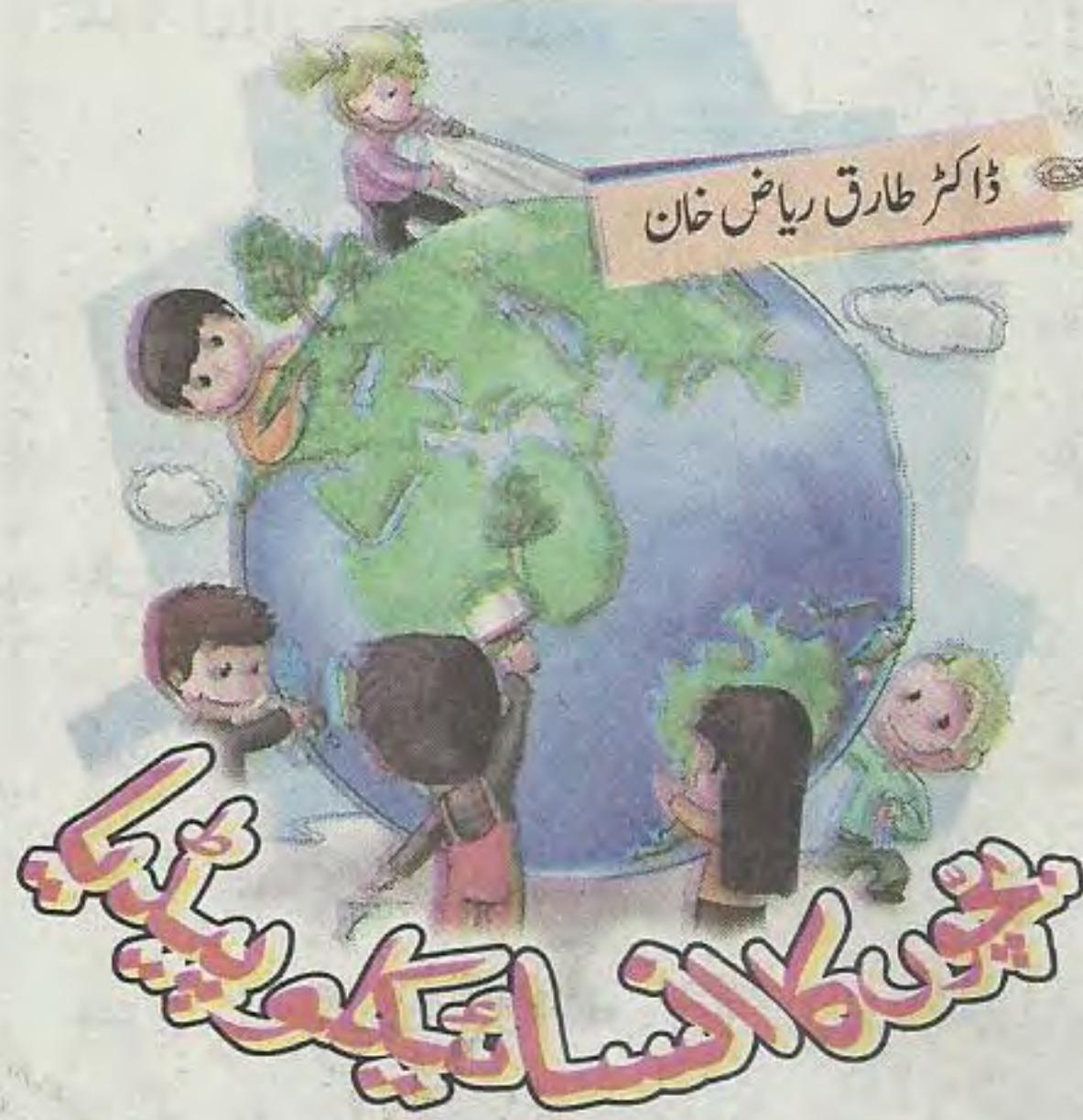
کے برابر تھا۔ گولڈن ایگل (Aquila Chrysaetos) نے 1954ء میں اسکاٹ لینڈ میں بہت بڑا گھونسل بنایا تھا جس کی گہرائی 4.57 میٹر (15 فٹ) تھی۔ پرندے اپنے گھونسلے درختوں کے تنے، شاخوں یا چٹانوں میں تعمیر کرتے ہیں۔

مسجد سلطان احمد

سلطان احمد مسجد ترکی کے شہر استنبول کی تاریخی مسجد ہے جسے نیلی مسجد (Blue Mosque) بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر 1609ء میں شروع ہوئی اور 1616ء میں تکمیل کو پہنچی۔ اس مسجد کے 6 مینار تھے۔ بعد ازاں اس میں سلطان کے حکم پر ایک اور مینار کا اضافہ کر دیا گیا۔ اس خوب صورت مسجد میں بیک وقت 10 ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ اس کی لمبائی 72 میٹر، چوڑائی 64 میٹر



جب کہ گنبد کی بیرونی بلندی 43 میٹر اور داخلی چوڑائی 23.5 میٹر ہے۔ مسجد کے مینار 64 میٹر بلند ہیں۔ مسجد کے مرکزی دروازے پر کئی گنبد ہیں جن میں مرکزی گنبد کا قطر 33 میٹر اور بلندی 43 میٹر ہے۔ مسجد کی دیواروں میں انسانی ہاتھوں سے بنی دلکش ٹائلیں لگی ہیں جن کی تعداد 23 ہزار ہے۔ مسجد کے در و دیوار پر اس وقت کے عظیم خطاط سید قاسم غباری نے قرآنی آیات تحریر کیں۔ مسجد میں لگے شیشے کی دیواروں میں قائم 20 سے زائد سوراخوں سے قدرتی روشنی چھن چھن کر اندر داخل ہوتی ہے جو مسجد کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ لاکھوں سیاح ہر سال اس عظیم عبادت گاہ



گھونسلہ

دُنیا بھر کے پرندے اپنے رہنے کے لیے گھونسلے (Nest) تعمیر کرتے ہیں۔ گھونسلے میں رہائش کے ساتھ ساتھ وہ انڈے بھی دیتے ہیں اور ان انڈوں سے جو بچے نکلتے ہیں ان کی نگہداشت بھی ان گھونسلوں میں کرتے ہیں۔ دُنیا کا سب سے بڑا گھونسلہ بنانے کا اعزاز چیل کے جوڑے کو حاصل ہے۔ 1963ء میں ان چیلوں



"Bald Eagles" یعنی (Haliaeetus Leucocephalus) نے امریکی ریاست فلوریڈا میں 2.9 میٹر (9 فٹ 6 انچ چوڑا) اور 6 میٹر (20 فٹ) گہرا گھونسلہ بنا کر سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس گھونسلے کی تعمیر میں استعمال ہونے والا مواد جب تو لا گیا تو یہ لگ بھگ 2 ٹن 4409 پاؤنڈز

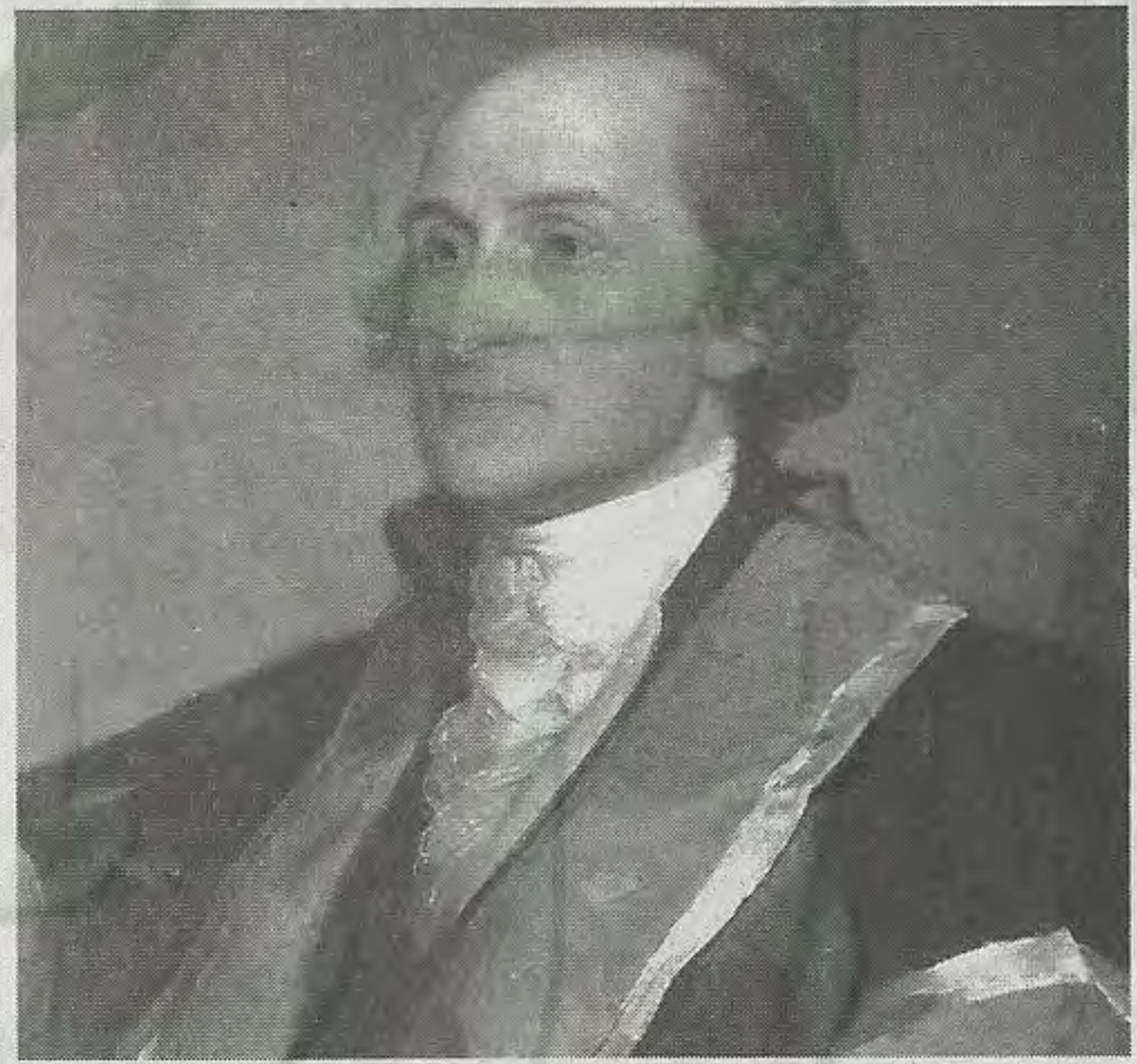
کو دیکھنے آتے ہیں۔

جنگ لڑی اور فتح حاصل کی۔

جارج واشنگٹن

واشنگ مشین

جارج واشنگٹن (George Washington) امریکہ کے پہلے صدر تھے۔ آپ 22 فروری 1732ء کو امریکی ریاست ورجینیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام Augustine Washington اور والدہ کا نام میری بال (Mary Ball) تھا۔ جارج واشنگٹن کے والدین کی وفات کے بعد اس کی زندگی میں خاصی تبدیلیاں آئیں۔ جارج واشنگٹن نے آرمی بھی جوائن کی۔ ورجینیا رجمنٹ میں بھی ملازمت کی۔ آپ نے فرانس اور



انڈین جنگ میں بھی حصہ لیا۔ اپنی ولولہ انگیز شخصیت کی بدولت آپ نے ملکی سطح پر خاص نام اور مقام بنا لیا۔ 1789ء میں پہلی بار صدارت کے لیے انتخاب ہوا، یوں جارج واشنگٹن کو پہلے امریکہ صدر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 30 اپریل 1789ء کو صدارتی حلف لے کر تاریخ کا حصہ بن گئے۔ آپ نے Martha "Dandridge" نامی خاتون سے شادی کی۔ آپ کی وفات بروز ہفتہ بوقت رات 10 بجے 14 دسمبر 1799ء کو 67 برس کی عمر میں ہوئی۔ وفات کے بعد 1847ء میں جارج واشنگٹن کی تصویر والے ڈاک ٹکٹ شائع کیے گئے۔ اب تک کئی مالیت کے ڈالر کرنسی اور ڈاک ٹکٹ جارج واشنگٹن کی یاد میں چھپ چکے ہیں۔ امریکی تاریخ کو فخر ہے کہ جارج واشنگٹن نے برطانیہ کے خلاف امریکی انقلابی

کپڑے دھونے والی مشین کو عموماً واشنگ مشین یا لانڈری مشین (Laundry Machine) کہتے ہیں۔ کپڑے دھونے کی تاریخ تب سے شروع ہوئی جب سے انسان نے کپڑے پہننا شروع کیے۔ 1797ء میں پہلی مرتبہ ہاتھوں کی بجائے مشین کی مدد سے کپڑے دھونے والی سادہ سی مشین کا استعمال ہوا۔ 1930ء میں گھومنے والی مشین بنی جسے 1858ء میں ہیملٹن سمیتھ (Hamilton Smith) نے اپنے نام سے رجسٹرڈ کروایا۔ 1934ء میں پہلی مرتبہ امریکی ریاست ٹیکساس میں پہلی مرتبہ لانڈری کی دکان کھلی جس کا مالک انڈریو کلن تھا۔ 1937ء میں پہلی مرتبہ آٹو میٹک واشنگ مشین متعارف ہوئی حتیٰ کہ 1990ء تک اس میں متعدد تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جرمنی، نیوزی لینڈ، کینیڈا سمیت متعدد ممالک نے اس میں نئی جدتیں شامل کیں۔ 2000ء میں ڈبل سلنڈر، 2004ء میں ڈبل واشنگ پلیٹ والی مشین بھی



مارکیٹ میں آگئی۔ اب کپڑے خشک کرنے اور کم پانی اور کم صابن سے دھونے والی واشنگ مشین بھی دستیاب ہے۔ چین، اٹلی، جاپان، پولینڈ، ہنگری وغیرہ واشنگ مشین بنانے والے بڑے ممالک ہیں۔

☆☆☆

i۔ مولوی فضل الحق ii۔ میاں فیروز الدین iii۔ سر آغا سوم

10۔ بل فائٹنگ کس ملک کا قومی کھیل ہے؟

i۔ سپین ii۔ امریکہ iii۔ اٹلی

جوابات علمی آزمائش جنوری 2014ء

1۔ تعریف کیا گیا۔ 2۔ موسم بہار۔ 3۔ فارسی۔ 4۔ پانی اور خشکی۔ 5۔ نوزکون۔ 6۔ لبنان۔ 7۔ 23 مارچ۔ 8۔ موچی دروازہ، لاہور۔ 9۔ سنیل گواسکر۔ 10۔ بال جبریل۔

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ ولی حسین، حیدر آباد (150 روپے کی کتب)

☆ صفی الرحمان، لاہور (100 روپے کی کتب)

☆ محمد فیاض الحسن، چکوال (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

مریم یوسف، مطیع الرحمن، حسین احمد، محمد دانیال متین، لاہور۔ فاطمہ

آفتاب، کراچی۔ فجر خان، نوشہرہ۔ تحریم مریم شاہد، ملتان۔ عامر سہیل،

بھکر۔ طلال طارق، راول پنڈی۔ ندا خان۔ پشاور۔ عائشہ ندیم،

مردان۔ دروج اسلم، راول پنڈی۔ ربیعہ اقبال، کراچی۔ محمد شادمان

صابر، لاہور۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی۔ ملک واصف رحمان، جہلم۔ محمد

ایاز لاہور۔ ہدیٰ بنت اخلاق، اسلام آباد۔ محمد حذیفہ انوار، جھنگ۔

رانا بلال احمد، محمد حظلہ فاروق، شمر خان، محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔

عبداللہ شاہ، دریا خان۔ عاصم محمد وڑائچ، اسلام آباد۔ علیشہ ادریس،

کراچی۔ خدیجہ فہد، گوجرانوالہ۔ حافظ عمیر بن عابد، حافظ آباد۔ محمد

عرفان اقبال، دنیا پور۔ محمد ریان احمد، اسلام آباد۔ محمد بلال عباس، سید

شہریار علی، لائبہ کائنات، لاہور۔ عاصم طفیل، محمد زین عظمت،

گوجرانوالہ۔ عمیمہ بابر، سیال کوٹ۔ شرجیل انجم ڈوگر، کمالیہ۔ آمنہ علی،

اسلام آباد۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ مریم رضوان، راول

پنڈی۔ محمد عثمان علی، عدن سجاد، جھنگ۔ راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادنخان۔

مدثر رحمان، سیال کوٹ۔ محمد وقار، جہلم۔ عروج نوید، لاہور۔ محمد عتیق

الرحمن اسلم، چکسواری۔ بلال احمد، حسن ابدال۔ فائز محمد فاروق،

کراچی۔ رضوان اشہد، پشاور۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ کامران

ہمایوں، عیشہ عتیق احمد، لاہور۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ محمد عمیس، کلور کوٹ۔



درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ قرآن کی سورۃ فیل میں کس کی شکست کا حال لکھا ہوا ہے؟

i۔ ابرہہ ii۔ ابو جہل iii۔ نیرو

2۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا لقب کیا ہے؟

i۔ غوث اعظم ii۔ وارث النبی فی الہند iii۔ بری امام

3۔ علم حیاتیات کی وراثت سے متعلق شاخ کیا کہلاتی ہے؟

i۔ نباتات ii۔ جینیٹکس iii۔ علم الاجسام

4۔ ”بازیمچہ“ اطفال ہے دنیا میرے آگے۔ ہوتا ہے شب و روز

تماشا میرے آگے، برصغیر کے کس عظیم شاعر کا شعر ہے؟

i۔ علامہ اقبال ii۔ مرزا غالب iii۔ فیض احمد فیض

5۔ ذیل میں کون سا پانی جلد منجمد ہو جاتا ہے؟

i۔ سادہ پانی ii۔ نمکین پانی iii۔ بارش کا پانی

6۔ کس دریا کے نام پر افغانستان کے ایک شہر کا نام بھی ہے؟

i۔ دریائے کابل ii۔ دریائے غزنی iii۔ دریائے سندھ

7۔ واٹر پولو کے کھیل میں ہر ٹیم کے کھلاڑیوں کی کتنی تعداد ہوتی ہے؟

i۔ 9 کھلاڑی ii۔ 7 کھلاڑی iii۔ 10 کھلاڑی

8۔ پاکستان کی مشہور جھیل لالو ساکس وادی میں واقع ہے؟

i۔ وادی سوات ii۔ وادی کاغان iii۔ وادی ہنزہ

9۔ بنگال کی کس مشہور شخصیت کو شیر بنگال کہا جاتا ہے؟



دھاری دار آملیٹ

اس ترکیب کے مطابق آملیٹ کو بالکل منفرد طریقے سے بنائیں۔ بہت خوش نما دکھائی دیتا ہے۔ نہ صرف ناشتے کی میز پر سب کی نگاہوں کا مرکز ہوگا، بلکہ بچے سکول لے جانے میں بھی بے حد خوشی محسوس کریں گے۔

اشیاء:

- | | |
|-------------------------------|---------------------------------|
| پالک کے پتے: 100 گرام | ہرا دھنیا یا پودینہ: ایک کپ |
| لہسن: دو جوئے | انڈے: چھ عدد |
| کش شدہ پنیر: تین کھانے کے چمچ | نمک و سیاہ مرچ پاؤڈر: حسب ضرورت |
| مچھلی کا گوشت: 150 گرام | تیل: حسب ضرورت |

ترکیب:

- 1- پالک یا سلاد کے پتے بالکل باریک کاٹ کر چورا کر لیں۔
 - 2- ایک کپ ہرا دھنیا یا پودینے کے پتے دھو کر بالکل باریک کاٹ کر چورا کر لیں۔
 - 3- لہسن چھیل کر باریک کر لیں۔
 - 4- انڈے ایک پیالے میں توڑ کر پھینٹ لیں۔ نمک اور تازہ پسلی ہوئی سیاہ مرچ ملا دیں۔
 - 5- بڑے فرائی پین میں تین کھانے کے چمچ تیل گرم کر کے آملیٹ دونوں جانب سے تل کر نکال لیں۔ تیز چھری سے کنارے کاٹ کر چوکور کر لیں۔
 - 6- دوسرے پیالے میں کش شدہ پنیر، بقیہ دھنیا، ایک چائے کا چمچ تیل اور مچھلی کا پکا ہوا ملید شدہ گوشت (مچھلی کی جگہ مرغی کا گوشت بھی لیا جاسکتا ہے) ملا دیں۔ بالکل ملائم ہو جائے۔
 - 7- اس آمیزے کو آملیٹ پر پھیلا کر اسے رول کر دیں۔ المونیم فوائیل میں پٹیٹ کر بارہ گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔
 - 8- پیش کرنے سے پہلے فوائیل اتار کر رول کو قتلوں میں کاٹ کر پٹیٹ میں گول سرکل کی صورت میں رکھ دیں۔
- بے حد لذیذ اور خوبصورت آملیٹ تیار ہے۔

نماز

علم

دینِ اسلام کا اک اہم رکن ہے یہ نماز
بے حیائی سے، بُرائی سے بچاتی ہے نماز
پانچ اوقات ہیں اک دن میں، مقرر اس کے!
اور عیدین و تہجد کی الگ ہوتی ہے نماز
رب سے ملنے کا یہ انداز جداگانہ ہے!
سجدۂ شکر کا احساس دلاتی ہے نماز
میرے سرکار کو جو کچھ بھی ملا، اس سے ملا!
دیکھ لو! قرآن میں، کیسی ہے منزل کی نماز؟
گونجتی ہے جو صدا مسجدوں سے شام و سحر!
وہ صدا سب کو بلاتی ہے کہیں جس کو نماز
اپنے منہ کو نہ کبھی، رب کے حکم سے موڑو!
آؤ مسجد میں چلیں اور پڑھیں سب ہی نماز

علم کرو تم ہر دم حاصل
بن جاؤ کامل انسان
علم سے حکمت، علم سے عظمت!
علم سے نعمت، علم سے شان
علم ہے مومن کی میراث
اسے بڑھاؤ تم ہر آن!
علم کی پیاس بڑھاتے رہنا
ہو گا اسی سے اونچا مان
علم سے کر دو دُنیا روشن
جگ مگ کر دو پاکستان

ڈاکٹر سید نعیم احمد ادیب جعفری





دو دھاری تلوار

کہ حضور دُنیا کے سب سے خوش نصیب انسان ہیں۔ قسمت نے وہ تمام نعمتیں آپ کی جھولی میں ڈال دی ہیں، جن کا ایک عام آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ ایک خوش حال اور دولت مند ملک کے بادشاہ ہیں۔ آپ کے خزانے سونے چاندی، ہیرے جواہرات سے بھرے ہوئے ہیں۔ آپ کے دسترخوان پر لذیذ کھانے چنے جاتے ہیں۔ آپ قیمتی لباس پہنتے ہیں۔ آپ کی رعایا ہر وقت ہاتھ باندھے، آپ کے حکم کی منتظر رہتی ہے اور.....“

”ٹھہرو!“ بادشاہ نے دیموقلیس کی بات کاٹ کر کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں شعلے سے لپکنے لگے تھے۔ مٹھیاں بھیجنے لگی تھیں لیکن اس کی یہ حالت صرف چند سیکنڈ رہی۔ جلد ہی وہ اپنی اصل حالت پر لوٹ آیا۔ اس نے مسکرا کر دیموقلیس کی طرف دیکھا اور بولا:

”تو تمہارے خیال میں ہم دُنیا کے سب سے خوش نصیب انسان ہیں۔ ٹھیک ہے، آج رات ہم اپنی یہ تمام خوش نصیبی تمہیں دے دیں گے۔ آج رات کے کھانے پر تم ہماری کرسی پر بیٹھو گے۔“

ریاست سیرا کیوس کا بادشاہ، ڈیوانی سیس، اپنے درباریوں کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا ایک نوجوان درباری، دیموقلیس، کچھ سوچ رہا ہے۔ اس کا دھیان کھانے کی طرف نہیں ہے۔

بادشاہ نے کھانے سے ہاتھ روک لیا اور بولا۔ ”کیا تم اپنی سوچوں میں ہمیں شریک کرنا پسند کرو گے، دیموقلیس؟“

بادشاہ کے اس سوال سے دیموقلیس گھبرا گیا۔ خوف کی ایک ٹھنڈی لہر اس کی ریڑھ کی ہڈی پر دوڑ گئی۔ وہ اس وقت بھی انہی خیالوں میں گم تھا جو اس کے دماغ میں اس وقت سے کھلبلی مچا رہے تھے جب وہ بادشاہ کے درباریوں میں شامل ہوا تھا۔ اس کے یہ تلخ خیالات ڈیوانی سیس کے خلاف تھے، جسے دُنیا کی ہر نعمت میسر تھی اور دیموقلیس کو صرف اسی پر گزارہ کرنا پڑتا تھا جو بادشاہ اسے دیتا تھا۔

اس نے سوچا، چاہے کچھ ہو، آج مجھے اپنے دل کی بات بادشاہ کو بتا دینی چاہیے۔ اس نے کہا۔ ”عالی جاہ! میں یہ سوچ رہا تھا

تمہارے سر پر ہمارا تاج ہو گا، اور تمام لوگ اسی طرح تمہارا حکم مانیں گے، جس طرح ہمارا مانتے ہیں۔

رات کو جب تمام درباری شاہی محل کے کھانے کے کمرے میں جمع ہو گئے تو بادشاہ نے دیموقلیس کو اپنی کرسی پر بٹھایا، اپنا سنہری تاج اس کے سر پر رکھا اور خود درباریوں کے ساتھ اس کرسی پر بیٹھ گیا، جس پر دیموقلیس بیٹھتا تھا۔

کھانے کی میز کے چاروں طرف شاہی ملازم، ہاتھ باندھے، دیموقلیس کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے رعب دار آواز میں کہا۔ ”کھانا لگایا جائے!“ ملازموں نے ادب سے سر جھکایا اور باہر چلے گئے۔

دیموقلیس نے سامنے بیٹھے ہوئے درباریوں پر نظر ڈالی، وہ ادب سے سر جھکائے بیٹھے تھے، اور ان میں ڈایونی سیس بھی تھا۔ پھر اس کی نظریں کمرے میں رکھی ہوئی قیمتی اشیاء کا جائزہ لیتی ہوئی چھت کی طرف اٹھیں تو اس نے ایک ایسا دہشت ناک منظر دیکھا کہ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے پیچی۔

اس کے سر سے صرف چند انچ اوپر، باریک دھاگے سے بندھی ہوئی، ایک دو دھاری تلوار لٹک رہی تھی۔ یہ دھاگا ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے ٹوٹ سکتا تھا، اور تلوار نیچے گر کر دیموقلیس کے سر کے دو ٹکڑے کر سکتی تھی۔

”تو آخر تم نے اس تلوار کو دیکھ ہی لیا۔“ بادشاہ ڈیوانی سیس نے مسکرا کر کہا۔ ”تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی دو دھاری تلوار، جو تمہارے سر پر لٹکی ہوئی ہے، ہر بادشاہ، ہر حاکم کے سر پر ہر وقت لٹکی رہتی ہے۔“

دیموقلیس چپ چاپ، گم صم بیٹھا تھا۔ وہ اس ڈر سے سانس بھی



آہستہ لے رہا تھا کہ اس کے ہلنے سے تلوار کا دھاگا نہ ٹوٹ جائے۔

بادشاہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”پڑوسی ملک کا کوئی لالچی بادشاہ، کوئی سازشی وزیر، فوج کا کوئی جرنیل، ان میں سے کوئی بھی، کسی بھی وقت، تلوار کا یہ کم زور دھاگا توڑ سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر بادشاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر دیموقلیس کے پاس آیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”اب تم سمجھ گئے ہو گے کہ بادشاہت اور حکومت پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کی سیج ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر تھا کہ اپنی جگہ اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ ہماری جگہ، تلوار کے نیچے، بیٹھنے کی تمنا نہ کرتے۔“

بادشاہ نے دیموقلیس کے سر سے تاج اتار کر اپنے سر پر رکھ لیا، اس سے اس جگہ جانے کو کہا، جہاں وہ بیٹھتا تھا اور پھر تلوار کی طرف دیکھے بغیر، شاہی کرسی پر بیٹھ گیا۔

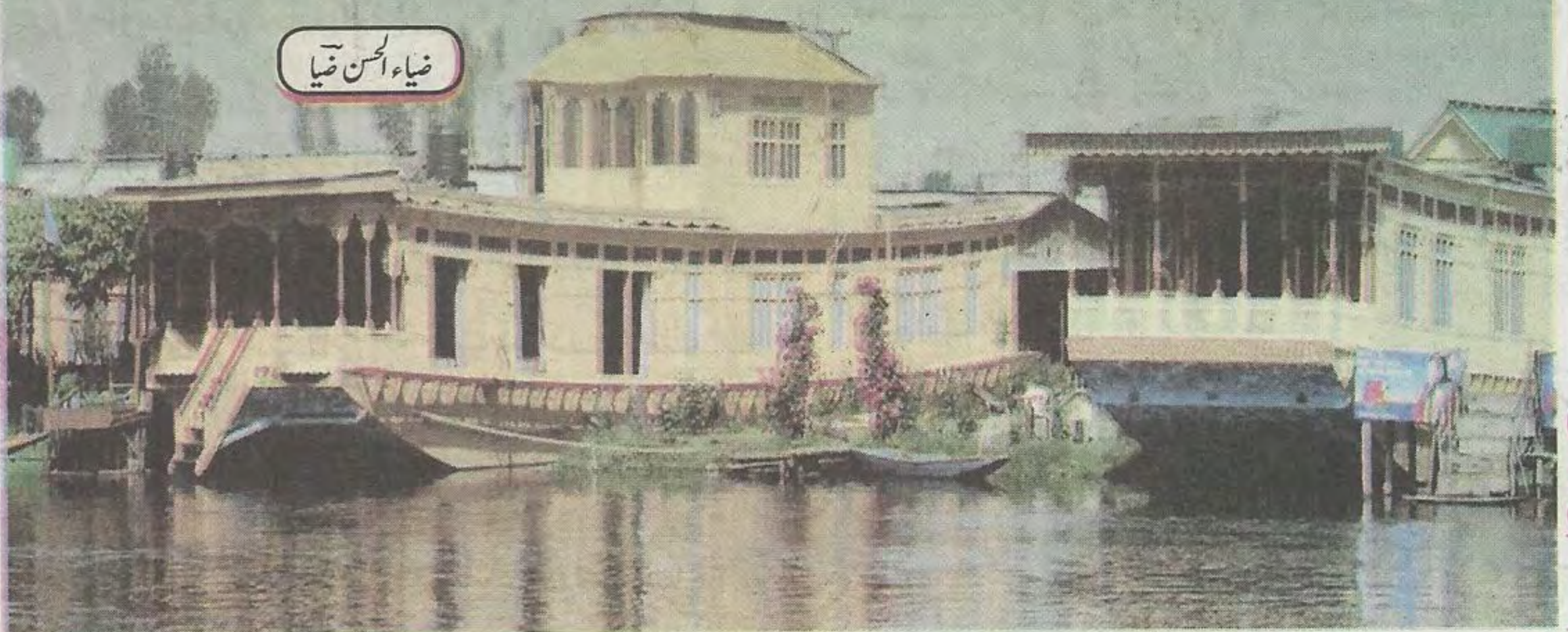
دیموقلیس نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر سکھ کا سانس لیا۔ اس کے سر پر کوئی تلوار لٹکی ہوئی نہ تھی۔ اس وقت وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان بادشاہ ڈیوانی سیس نہیں، وہ خود ہے۔

پیارا پیارا کشمیر

پیارا پیارا ہے کشمیر
جنت سارا ہے کشمیر

تازہ ہوائیں ہیں اس کی پیاری فضا ہیں اس کی
اس کے بہادر بچے ہیں اپنے قول کے سچے ہیں
آئے گا وہ دن بھی ضرور ہو گا آزادی کا نور
ظلم کی ٹوٹے گی زنجیر اس کی بدلے گی تقدیر
سب کشمیری اپنے ہیں روشن ان کے سپنے ہیں
ساتھ ہیں ان کے ہم سب ہی سن لیں سارے دشمن بھی
غاصب سب مر جائیں گے اپنے منہ کی کھائیں گے
آزادی مل جائے گی
دل کی کلی کھل جائے گی

ضیاء الحسن ضیا



کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

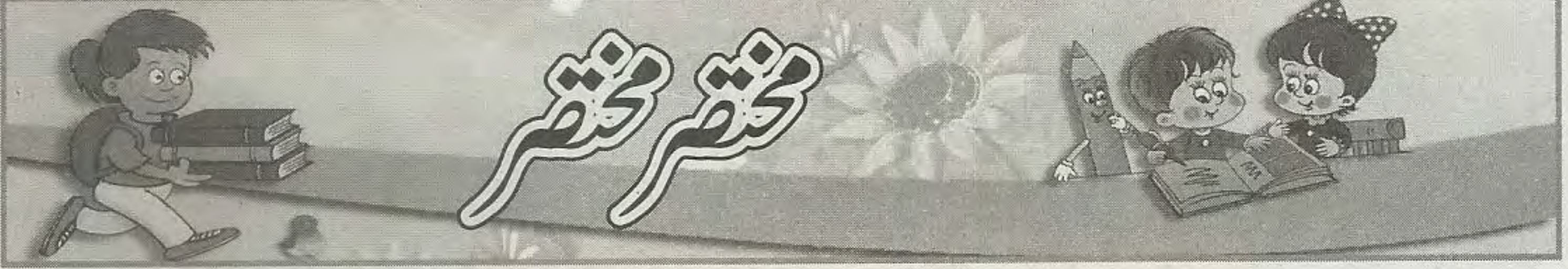


نادیہ کو کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔ وہ اکثر اپنی امی جان کے ساتھ باورچی خانے میں موجود رہتی اور کھانا پکانا سیکھنے کی کوشش کرتی تھی۔
 ”امی جان آج آپ کیا پکا رہی ہیں؟“ نادیہ نے امی جان سے پوچھا۔
 ”بیٹی! آج سبزی اور گوشت پکے گا۔“ امی جان نے فریج سے سبزی اور گوشت نکالتے ہوئے کہا۔
 امی جان نے اچانک نادیہ کی ذہانت کی آزمائش کے لیے ایک سوال کر ڈالا۔
 ”نادیہ اس گوشت کا وزن ایک پاؤ ہے۔ اس گوشت سے تین مختلف کھانے پکاؤ، مگر ہر کھانے میں ایک پاؤ گوشت ہو۔“
 پیارے بچو! آپ بھی ذرا دماغ پر زور ڈالیں اور اس سوال کا جواب لکھ کر بھیجیں کہ کس طرح ایک پاؤ وزن گوشت سے تین مختلف کھانے پکیں گے اور ہر کھانے میں ایک پاؤ گوشت ہوگا۔



جنوری 2014ء میں شائع ہونے والے ”کھوج لگائیے“ کا صحیح جواب یہ ہے: کچھوا ہارے گا۔
 جنوری 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

- 1- عابدہ الیاس، ہری پور
- 2- عمیرہ حماد، کراچی
- 3- عروب عامر ملک، لاہور
- 4- محمد حامد رضا قادری، کاموگی
- 5- محمد دانیال متین، لاہور



”بھوک لگی ہے امی جان!“

یہ ہیں مسٹر پیٹو خان

کہتے تھے کل ان کے خالو
ان کے آگے رکھ دو آلو
شلغم، گوبھی، ساگ، کچالو
کھیرے، خربوزے، شفتالو

اور زمانے کے پکوان

یہ ہیں مسٹر پیٹو خان

دنیا میں کچھ لوگ ہیں ایسے
جن کے پاس اگر ہوں پیسے
پھر چرتے رہتے ہیں ایسے
گائے، اونٹ اور ہاتھی جیسے

تم ہوتے ہو کیوں حیران

یہ ہیں مسٹر پیٹو خان

(خالد بزمی)

نیا سال

نیا سال میرے وطن کا قرار میں رہے

یہ گلشن امن کا سدا بہار میں رہے

شاہیں چھوتا رہے کہساروں کی بلندیوں کو

یہ سال آداب انسانیت کے شمار میں رہے

لہو کے پیاسے درندوں کو خدا ہدایت دے

غدار وطن ہمیشہ ڈینگلی بخار میں رہے

صاحب علم کو عزت ملے نئے دن کے ساتھ

تعمیر و ترقی کا دامن اسی معمار میں رہے

دورِ ظلمت ختم ہو کر کشمیر میں جلد ہی

یہ بازیچہ ظلم کا ہار میں رہے

نعت

ورد صلے علی کا کریں چار سو

یہ صبا گنگناتی پھرے گوبکو

جن کی خاطر بھی ہے یہ بزم جہاں

بحر و بر، چاند، تارے، زمیں، آسمان

جن پہ رب نے اتارا ہے اپنا قرآن

کیوں نہ ہر نفس ان کی کرے گفتگو

یا الہی دکھا دے کبھی وہ گھڑی

روضہ اقدس پہ ہوں دست بستہ گھڑی

لب پہ نعت، آنکھ میں آنسوؤں کی لڑی

ہے دعا بھی یہی اور یہ آرزو

آپ سا حسن اب تک نہ دیکھا گیا

نور پھیلا ہے جب بھی تبسم کیا

شان سرکار میں اور کہے کیا وفا

پیکر حسن وہ اور وہی خوب رو

(عنبر سلیم وفا، سیال کوٹ)

پیٹو خان

ان سے واقف ایک جہان

غیر ہو کوئی یا انجان

کافی ہے ان کی پہچان

یہ ہیں اور ہے دستِ خوان

کھانا ہے ان کا ایمان

یہ ہیں مسٹر پیٹو خان

مکتب میں جاتے ہیں یہ

الم غلم کھاتے ہیں یہ

جب گھر لوٹ کے آتے ہیں یہ

آ کر شور مچاتے ہیں یہ

تقریب 2014 فروری

طربناک ہے میرے لیے وطن کی غلامی منزل
زندگی ساری میری اسی سیار میں رہے
(مزل حسین مزل، پاک پتن)

دعوت و تبلیغ میں نکلنے کے آداب و اعمال

حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کو ایک جماعت میں بھیجا اور وہ جمعہ کا دن تھا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے فرمایا، میں ٹھہر جاتا ہوں تاکہ رسول ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھوں، پھر اپنے ساتھیوں سے جا ملوں گا۔ جب انہوں نے رسول ﷺ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی تو رسول ﷺ نے انہیں دیکھ کر فرمایا، تم اپنے ساتھیوں کے ساتھ صبح جانے سے کیوں ٹھہر گئے؟ انہوں نے عرض کیا، میں نے چاہا کہ آپ ﷺ کے ساتھ جمعہ پڑھ لوں گا۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم زمین میں جو کچھ ہے سب کا سب خرچ کر دو تو بھی صبح کے وقت جانے والے ساتھیوں کے برابر ثواب حاصل نہیں کر سکو گے۔
(محمد ابو بکر عظیم، شورکوٹ)

تعلیم و تربیت

حضرت تھانویؒ کے احباب میں سے ایک صاحب نے حضرت والا سے عرض کیا تھا کہ ری یونین کا ایک وزیر حضرت سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ حضرت نے فرمایا کہ اسے لے آنا۔ جب وہ صاحب وزیر کو لائے اور انہیں کمرے میں لانے کی اجازت چاہی تو حضرت والا نے فرمایا کہ اسے دوسرے کمرے میں بٹھاؤ کیوں کہ اگر وہ یہاں آیا تو مجھے اٹھنا پڑے گا جس سے اکرام کا فر لازم آئے گا اور میں جاؤں گا تو اسے اٹھنا پڑے گا۔
سبحان اللہ بظاہر تو یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مگر حفاظتِ دین کا خزانہ ہیں۔
(فضیلہ نیاز، واہ کینٹ)

حضرت محمد ﷺ نے فرمایا:

مجھے بچوں کی پانچ عادات بہت پسند ہیں۔
☆ وہ رورو کر مانگتے ہیں اور اپنی بات منوالیتے ہیں۔

☆ وہ مٹی میں کھیلتے ہیں، یعنی غرور اور تکبر خاک میں ملا دیتے ہیں۔
☆ لڑ جھگڑ کر صلح کر لیتے ہیں، یعنی کہ حسد نہیں رکھتے۔
☆ جومل جائے وہی کھا لیتے ہیں یعنی ذخیرہ کرنے کی ہوس نہیں رکھتے۔

☆ مٹی کے گھر بناتے ہیں اور کھیل کر گرا دیتے ہیں۔ (یعنی بتاتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے۔)
(شفیق الرحمن، شورکوٹ)

اقوال زریں

☆ سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ کے اندر حوصلہ باقی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی آپ نے کچھ نہیں کھویا۔
☆ ہر آدمی اپنے گزشتہ کل کو کھو چکا ہے، کامیاب وہ ہے جو اپنے آج کو نہ کھوئے۔
☆ اگر تم اپنا راز اپنے دشمن سے چھپانا چاہتے ہو تو اس کو اپنے دوست سے بھی نہ کہو۔
☆ اگر آپ عمل میں کم ہوں تو زیادہ الفاظ بول کر آپ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔
☆ کسی شخص نے جو چیز محنت کے ذریعے حاصل کی ہے، آپ اس کو صرف خواہش کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے۔
☆ اگر آپ بولنا نہیں جانتے تو چپ رہنا چاہیے کیوں کہ چپ رہنا بھی اتنا ہی بڑا کام ہے جتنا کہ بولنے کا۔
☆ مواقع کو استعمال کرنے کا نام قیادت ہے اور موقع کو برباد کرنے کا نام حماقت ہے۔
(دانش علی دانش، مرید کے)

سنہری باتیں

☆ مصائب سے مت گھبراؤ، ستارے اندھیرے میں ہی چمکتے ہیں۔
☆ وقت اگر قیمتی ہے تو اس کا صحیح استعمال کرو۔
☆ ہر شخص کو اس کے ہنر اور جوہر کے مطابق جگہ دینی چاہیے۔
☆ عبادت میں دل کی، مجلس میں زبان کی، غصے میں ہاتھ کی اور دسترخوان پر پیٹ کی حفاظت کرو۔
☆ حکمت اور دانائی مفلس کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔
☆ زیادہ سنو اور کم بولو۔
(حسالہ ندیم، کاموکی)



ذرا سنا میاں منو

بات ذرا انوکھی تھی۔ منو میاں کی سمجھ میں نہ آئی۔ بھلا کوئی جان دار اتنے دنوں بھوکا پیاسا رہ سکتا ہے؟ اونہہ جھوٹ، یہ کتاب لکھنے والے بھی کتنے وہ ہیں جو ایسی اوٹ پٹانگ باتیں لکھ دیتے ہیں۔ ان سے رہا نہ گیا۔ جھنجھلا کر بولے:

”ابا جان، دیکھیے تو۔ ریچھ سارے جاڑوں سوتا رہے گا، نہ کچھ کھائے گا نہ پیے گا تو مرنے جائے گا؟“

ابا جان بولے۔ ”سردی کے موسم میں ریچھوں کے لیے خوراک حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، کیوں کہ درختوں، پودوں اور زمین پر برف جم جاتی ہے، اس لیے وہ غاروں اور کھوہوں میں گھس کر سو جاتے ہیں۔ اسے انگریزی میں ”ہائبرنیشن“ اور اروو میں ”سرما خوابی“ کہتے ہیں۔ ریچھوں کے علاوہ اور کئی جانور بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ مثلاً چمگادڑیں، گلہریاں، خرگوش، جنگلی چوہے،

چھٹی کا دن اور منو میاں بھلا نچلے بیٹھ جائیں؟ توبہ کرو! جب تک سارے گھر کو ناکوں چنے نہ چبوا دیں تب تک چین نہیں لیتے۔ اب دیکھیے، ابا جان تو جا رہے ہیں بازار، امی جان پکا رہی ہیں پراٹھے اور منو میاں باورچی خانے میں اودھم مچا رہے ہیں۔ دو ایک دفعہ تو امی نے نرمی سے کہہ دیا۔ ”مان جا بیٹا، مت میری جان ہلکان کر۔“ مگر منو میاں امی جان کی بات مان جایا کریں تو پھر ابا جان کس کام آئیں؟

آخر برآمدے میں سے ابا جان نے ڈانٹ پلائی۔ ”منو! جاؤ اپنا سبق یاد کرو۔“ اور منو میاں منہ لٹکا کر زور زور سے سبق یاد کرنے لگے: ”ریچھ ساری گرمیاں تو جنگل میں منگل مناتے ہیں مگر جب سردی شروع ہوتی ہے تو غاروں میں گھس کر سو جاتے ہیں اور سردیوں بھر سوتے رہتے ہیں۔“

سانپ، بچھو اور کیڑے مکوڑے۔“

منو میاں نے پوچھا۔ ”مگر وہ بغیر کھائے پیے اتنے دن زندہ کیسے رہتے ہیں؟“

ابا جان نے کہا۔ ”سردیوں سے پہلے وہ خوب ڈٹ کر کھاتے ہیں، جس سے ان کے جسم پر چربی کی موٹی موٹی تہیں چڑھ جاتی ہیں۔ یہی چربی ان کے جسم کو خوراک پہنچاتی ہے اور اسے گرم بھی رکھتی ہے۔ بعض جانور مثلاً گلہریاں، خرگوش اور چوہے اپنے گھونسلوں اور بلوں میں خوراک اکٹھی کر لیتے ہیں اور سردیوں بھر تھوڑی تھوڑی کھاتے رہتے ہیں۔“

”اچھا، اب میں سمجھا!“ منو میاں نے کہا اور سائیکل لے کر باہر بھاگ گئے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

منو میاں کے ابا جان گلگت کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ آج کل اسکول میں سردیوں کی چھٹیاں تھیں۔

ایک دن منو میاں اپنے کسی دوست کے گھر سے آرہے تھے کہ کسی نے پیچھے سے پکارا۔ ”ذرا سنا، میاں منو!“

منو میاں نے رک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی بھی نہ تھا۔ ارے! تو کیا کان بجے تھے؟ لاجول پڑھ کر آگے بڑھے تو پھر وہی آواز آئی، اب کی ذرا زور سے ”ذرا سنا، میاں منو!“ اس دفعہ میاں منو نے پیچھے دیکھا تو اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

ان کے پیچھے تین ریچھ کھڑے تھے۔ ایک ریچھ، ایک ریچھنی اور ایک ان کا ننھا منا بچہ۔ اس وقت منو میاں کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ منہ فق، چہرے پر ہوائیاں، پاؤں رکھیں آگے تو پڑے پیچھے۔ ریچھ کا بچہ ان کی یہ حالت دیکھ کر کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اپنے باپ سے بولا:

”ارے، ابا جی! یہ آدمی کا بچہ تو بڑا ڈرپوک ہے۔ آپ تو کہتے تھے آدمی بہت بہادر ہوتا ہے۔“

”کون کہتا ہے، میں ڈرپوک ہوں؟“ منو میاں اکڑ کر بولے۔ ”آؤ کشتی لڑ لے۔“

ریچھ جلدی سے بولا۔ ”نہ نہ۔ غصہ کرنے کی بات نہیں۔ بات

یہ ہے کہ ہم تم سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”تو پھر جلدی سے پوچھو۔“ منو میاں بولے۔ ”مجھے گھر جانا ہے۔ دیر ہو گئی تو امی جان ناراض ہوں گی۔“

”بات یہ ہے، میاں کہ ہم اس جگہ نئے نئے آئے ہیں۔“ ریچھ نے کہا۔ ”سردی کا موسم شروع ہو گیا ہے مگر ہمیں ابھی تک یہاں کوئی ایسا غار نہیں ملا جس میں ہم سردیاں گزار سکیں۔ تم ہمیں کسی غار کا پتا بتا سکتے ہو؟“

”یہاں کوئی غار وار نہیں۔“ منو میاں نے کہا۔

ریچھ بولا۔ ”تو پھر تم کہاں سردیاں گزارو گے؟“

منو میاں بولے۔ ”میرا گھر جو ہے۔ اتنا لمبا چوڑا۔ مجھے غار میں رہنے کی کیا ضرورت ہے؟“

ریچھ خوش ہو کر بولا۔ ”تم ہمیں اپنے گھر لے چلو۔ اب کی سردیاں ہم تمہارے گھر ہی گزاریں گے۔“

”ارے واہ!“ منو میاں تڑاخ سے بولے۔ ”امی جان نے دیکھ لیا تو ایمان سے وہ جوتے پڑیں گے کہ نانی یاد آ جائے گی۔“

”دیکھو میاں!“ ریچھ آنکھیں نکال کر بولا۔ ”جو میں کہتا ہوں، وہ کرو۔ ورنہ یاد رکھو! تمہارے ساتھ تمہاری امی کی بھی تکا بوٹی کر دوں گا۔“

منو میاں ڈر کے مارے راضی ہو گئے۔

امی جان پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ ابا جان بھی کہیں گئے ہوئے تھے۔ منو میاں ان دن بلائے مہمانوں کو لے کر گھر پہنچے تو کچھ گڑ بڑ نہ ہوئی۔ ریچھ ادھر ادھر دیکھ کر بولا:

”واہ میاں! گھر تو تمہارا بڑا شان دار ہے۔ اے لو! کمرے میں دو پلنگ بھی بچھے ہوئے ہیں۔ بس، اب ہم سوتے ہیں۔ خدا نے چاہا تو گرمیوں میں اٹھیں گے۔“

”ارے رے رے!“ منو میاں گھبرا کر بولے۔ ”مگر ہم کہاں سوئیں گے؟“

”ہماری بلا سے، کہیں سو۔“ ریچھ نے جواب دیا اور منو میاں کو باہر نکال کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔



ایسی ترکیب آئی ہے کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے..... منو کی اماں،
تم تین انگلیٹھیوں میں کوئلے سلگا کر لے آؤ۔“

کمرے کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ابا جان کھڑکی کے راستے
کمرے میں گئے۔ امی نے انہیں دہکتی ہوئی انگلیٹھیاں دے دیں۔
ابا جان چپکے چپکے ریچھوں کے پاس گئے اور انگلیٹھیاں پلنگوں کے
پاس رکھ دیں۔ پھر کھڑکی بند کر کے دروازے کے راستے باہر آ
گئے۔ تھوڑی دیر بعد کمرہ گرم ہو گیا۔ ریچھوں کو گرمی لگی تو وہ ہڑبڑا
کر اٹھ بیٹھے۔ ریچھنی بولی۔ ”منے کے ابا، اب کے گرمیاں بڑی
جلدی آگئیں!“

ریچھ نے کہا۔ ”خدا جانے کیا بات ہے! میں خود حیران ہوں!“
بچہ بولا۔ ”اُف! میں تو گرمی سے پھنکا جا رہا ہوں، جلدی باہر چلیے۔“
ریچھ نے دروازہ کھولا اور تینوں آگے پیچھے باہر نکلے۔ دروازے
کے پاس ابا جان نے کتا باندھ دیا تھا۔ ریچھوں نے کتے کو دیکھا تو
بھاگے سر پر پاؤں رکھ کے۔ منومیاں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

منومیاں کمرے کے باہر کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ امی
جان آگئیں۔ وہ بولیں۔ ”بیٹے، اتنی دیر کہاں رہے؟ چلو، منہ ہاتھ
دھو۔ پھر کھانا کھانا۔“

منومیاں ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بولے۔ ”شی شی شی! آہستہ
بولیے۔ کمرے میں ریچھ سو رہے ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ امی حیرت سے بولیں۔
”سچ کہہ رہا ہوں۔“ منومیاں نے کہا۔ ”آپ خود چل کر دیکھ لیجیے۔“
امی نے کمرے کے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ اندر سے بند تھا۔
کواڑ کے شیشے میں سے جھانکا تو سر پیٹ لیا۔ سچ مچ تین ریچھ
پلنگوں پر لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔

جب ابا جان واپس آئے تو منومیاں نے انہیں ریچھوں کا قصہ
سنایا۔ وہ بھی بہت گھبرائے۔

منومیاں بولے۔ ”ابا جان، آپ انہیں گولی مار دیں۔“
ابا جان نے کچھ سوچا، پھر بولے۔ ”میرے دماغ میں ایک



سکھ کی گنتی

لائی، رائیل اور احسن سعدیہ کے پاس صوفے پر بیٹھے، دن بھر کی روداد سنا رہے تھے۔ سمیرا نے بستے ان کے کمرے میں رکھے اور بھاگ کر فریج سے مینگو اسکوائش کا جگ اور گلاس لے کر ان کے پاس پہنچ گئی۔ ان تینوں کو مینگو اسکوائش پیش کرنے کے بعد وہ ایک طرف خاموش سی کھڑی ہو گئی، وہ پسینے میں بری طرح شرابور تھی۔ پیاس سے اس کا حلق سوکھ رہا تھا مگر وہ یہاں سے نہیں ہل سکتی تھی جب تک مالکن کا حکم نہ ہوتا۔

رائیل نو اور احسن دس سال کے تھے۔ دونوں بچے بہت ہی نک چڑھے اور نخریلے تھے۔ سعدیہ بھی اپنے بچوں کے لاڈ اٹھاتی تھکتی نہیں تھی۔ وہ دونوں ہر چیز میں نخرہ کرتے تھے۔

سمیرا پچھلے دو سالوں سے ان کے گھر کے کام کرتی رہی تھی۔ سمیرا پانچ بہن بھائی تھے۔ سمیرا کی ماں بھی گھر گھر کام کرتی تھی۔ سمیرا کا باپ نشے کا عادی تھا۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ سمیرا کے باقی بہن بھائی چھوٹے تھے۔ صفائی کے لیے ایک اور کام والی رضیہ بھی آتی تھی مگر گھر کے چھوٹے موٹے کاموں اور بھاگ دوڑ سمیرا کے ننھے کندھوں پر تھی۔

”لوڈ شیڈنگ نے تو زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔ کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہو پاتا اور اوپر سے گرمی.....!! اللہ معاف کرے۔ لگتا ہے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔“

سعدیہ فون پہ باتیں کرنے میں مگن تھی۔ ساتھ ساتھ ڈسٹنگ کرتی ایک نظر سمیرا پر بھی ڈال رہی تھی۔ سعدیہ نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور سمیرا کو اشارہ کیا۔ دس سالہ سمیرا نے اپنی مالکن کے اشارے پر سر ہلایا اور باہر کی جانب لپکی۔ رائیل اور احسن کے آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ سمیرا گیٹ پہ پہلے سے موجود ہوتی تاکہ رائیل اور احسن کو انتظار نہ کرنا پڑے۔

سمیرا اٹھنڈے ٹی وی لاؤنج سے نکل کر باہر آئی تو تیز دھوپ نے اس کا استقبال کیا۔ سمیرا کو شدید گرمی میں گیٹ پر کھڑے ابھی دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ رائیل اور احسن کی وین کا ہارن سنائی دیا۔ سمیرا نے شکر کرتے ہوئے گیٹ کھولا۔ رائیل اور احسن نے روز کی طرح اپنے بستے اور پانی کی بوتل وہیں پھینکی اور اندر کی طرف بھاگ گئے۔ اب یہ سمیرا کی ذمہ داری تھی کہ ان دونوں کے بھاری بستوں کو اٹھا کر اندر لاتی۔ جب تک سمیرا بستے اٹھا کر اندر

سمیرا نے غربت میں آنکھ کھولی تھی مگر اس کا ذہن سوچوں کے عجیب تانے بانے بنتا رہتا تھا۔ وہ اکثر خود سے ہم کلام رہتی تھی۔ اس کے پاس بہت سے سوالات تھے جن کے جوابات اسے کوئی نہیں دیتا تھا۔

ابھی بھی سعدیہ کو رائیل اور احسن کے سوسونخرے اٹھاتا دیکھ کر وہ عجیب سے احساسات کا شکار تھی۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ رائیل اور احسن اس کے ہم عمر تھے مگر ان کے حالات و واقعات میں کتنا فرق تھا۔ جس عمر میں بچے جگنو و تیلیوں کے پیچھے بھاگتے ہیں، ہر فکر سے آزاد ہوتے ہیں، سمیرا کے ننھے کندھوں پر صدیوں کی تھکن سوار ہو گئی تھی۔ اس کا معصوم ذہن، فکر معاش کے گورکھ دھندے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

ٹھنڈے اے سی والے کمروں میں بیٹھ کر بھی یہ لوگ گرمی گرمی کا شور ڈالتے ہیں۔ کیا یہ لوگ جانتے ہیں کہ گرمی کیا ہوتی ہے؟ اور اسے کیسے برداشت کرتے ہیں؟ سمیرا نے رات کو اپنی چارپائی پر لیٹتے ہوئے، آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھ کر سوچا۔ فضا میں شدید جس تھا۔ ایک پنکھا تھا جس کی گرم ہوا بھی اتنے افراد کے لیے ناکافی تھی۔

سمیرا سونے سے پہلے اکثر اپنی زندگی اور ان کی زندگی کا موازنہ ضرور کرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اس کا وجود بھی سیاہ رات کی طرح ہے اور رائیل اور احسن روشن اور چمکتے ہوئے ستارے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت کے موجود ہوتے ہوئے بھی، رائیل اور احسن ہر چیز میں نخرے کرتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں سوسو نقص نکالتے تھے۔

”اور یہاں.....“ سمیرا نے گہری سانس لے کر کپے صحن میں پچھی چارپائیوں پر سوائے نفوس پر نظر ڈالی۔ ”یہاں بنیادی ضرورتوں کے لیے ترسا جاتا ہے پہننے کے لیے دوسروں کی اترن، کھانے کے لیے دوسرا کا بچا کچھا کھانا..... شدید گرمی ہو یا سردی، موسم کی سب سختیاں برداشت کرنا۔ آخر کیوں؟؟ اللہ میاں نے سب کو ایک جیسا کیوں نہیں بنایا؟ یہ غربت، یہ مفلسی ہمارے مقدر میں ہی کیوں لکھ دی گئی ہے؟“ سمیرا نے ایک دن یہ ہی سوال، سپارہ پڑھانے والی

باجی عابدہ سے پوچھ لیے۔ سمیرا کام پر جانے سے پہلے محلے میں سب کو قرآن کی تعلیم دینے والی باجی عابدہ کے گھر ضرور جاتی تھی اور اپنا روز کا سبق پڑھ کر کام کرنے جاتی تھی۔ سمیرا کی بات سن کر باجی عابدہ نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر مسکرا کر بولیں۔

”مجھے خوشی ہے کہ تمہارا ذہن، کائنات کی وسعتوں میں چھپے رازوں کو جاننے کی جستجو کرتا ہے۔ سوال کرنا اچھی بات ہے مگر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ سب سوالوں کے جواب فوراً یا حسب توقع بھی مل جائیں۔ تم نے اللہ تعالیٰ کی بنائی اس دنیا کی تقسیم پر سوال کیا ہے کہ تمہارا مقدر ایسا کیوں ہے؟

دیکھو سمیرا! یہ دنیا ہے جو ایک نظام کے تحت چل رہی ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر، اپنا کردار نبھا رہا ہے۔ کیا تم نے کبھی یہ غور کیا ہے کہ تم اب بھی بہت سے لوگوں سے بہتر ہو؟“

”میں اور بہتر..... وہ کیسے؟“ سمیرا نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”اس کا جواب تم خود ڈھونڈو گی۔ اپنی ”تلاش“ کا سفر خود کرتے ہیں۔ اب یہ تم خود ڈھونڈو گی کہ اللہ تم پر کیسے اور کس طرح مہربان ہے؟“ باجی عابدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مگر باجی میں کیسے ڈھونڈ سکتی ہوں؟ مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا۔“ سمیرا نے گھبراتے ہوئے کہا تو عابدہ باجی نے مسکرا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”سوال“ کرنے والے کو اس کا ”جواب“ ضرور ملتا ہے۔ چلو تمہاری آسانی کے لیے بتا دیتی ہوں کہ ہر چیز کو ”شکر“ کی نظر سے دیکھنا۔ تمہیں تمہارا جواب مل جائے گا۔ سمیرا نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور کام پر چلی گئی۔ اس بات کو کئی دن گزر گئے۔ سمیرا نے بہت بار کوشش کی مگر ”شکر“ کی نظر سے دیکھنا اسے سمجھ نہیں آئی۔ سمیرا ہر بار کوشش کرتی اور ہر بار ناکام ہوتی۔

وہ ہر بار سوچتی کہ ”شکر کی نظر“ کیا ہے؟ اور اس سے کیسے دیکھتے ہیں؟

اسی طرح دن پہ دن گزرتے جا رہے تھے مگر سمیرا کو اپنے کسی سوال کا جواب نہیں ملا تھا بلکہ اس کے شکوے پہلے سے بڑھ گئے تھے۔ ایک دن سمیرا روٹین کے مطابق کاموں میں مصروف تھی کہ ڈور بیل ہوئی۔ سمیرا نے کام کو وہیں چھوڑا اور گیٹ کھولنے چلی گئی



باہر شدید گرمی اور جس تھا۔
”کون ہے؟“ سمیرا نے
گیٹ کھولنے سے پہلے آواز
دے کر پوچھا۔

”بیٹا! مسافر ہوں۔ گرمی
شدید ہے، پانی پلا دو۔ مہربانی
ہو گی۔“ ایک کمزور سی آواز
سنائی دی۔

”معاف کرو بابا.....“ سمیرا
نے جھنجھلاتے ہوئے کہا اور
واپسی کے لیے مڑ گئی۔

”بیٹا! اللہ تمہیں اس کا اجر
دے گا۔ میرا پوتا بہت بیمار
ہے۔ ہم اس شہر میں اجنبی
ہیں۔“ بوڑھے شخص کی پھر آواز
سنائی دی۔

راستہ نہیں جانتے۔ بڑے ہسپتال جانا تھا۔ غلطی سے اس طرف نکل
آئے ہیں۔“ بوڑھے شخص نے اپنے چہرے پر آئے پسینے کو رومال
سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ میرا پوتا ہے علی احمد..... اس کے ماں باپ سیلاب کی نظر
ہو گئے تھے۔ بس اللہ کا کرم ہے جس حال میں رکھے۔ وہ اپنے
بندوں کو آزماتا ہے۔ کبھی دے کر اور کبھی لے کر۔ شاید اس نے
اپنے ماں باپ کی جدائی کو دل سے لگا لیا ہے۔ گاؤں کے حکیم سے
علاج کروایا ہے مگر یہ روز بہ روز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اب اس کو
شہر کے بڑے ہسپتال دکھانے لایا ہوں۔ شاید ڈاکٹر اس کی بیماری کا
پتا چلا سکیں۔“

بوڑھے شخص نے سمیرا کی سوالیہ نظروں کے جواب میں تفصیل
سے بتاتے ہوئے کہا۔ اس دوران علی احمد نظریں جھکائے خاموش
بیٹھا تھا۔

”بابا جی ایک بات پوچھوں.....“ سمیرا نے اپنے دل میں مچلتے
ہوئے سوال کو زبان دی۔

”رہنے دو۔ دادا..... اللہ مالک ہے۔“ ایک کمزور سی آواز
سنائی دی تو سمیرا نے چونک کر دروازے کے ہول سے باہر دیکھا۔
ایک بوڑھا شخص سات یا آٹھ سال کے بچے کا ہاتھ تھامے جا رہا
تھا۔ سمیرا نے کچھ دیر سوچا اور بھاگ کر فریج میں سے ٹھنڈے پانی
کی بوتل نکال لائی، گیٹ کھول کر دیکھا تو وہ دونوں نظر نہیں آئے۔
سمیرا نے تھوڑا آگے چل کر دیکھا تو وہ دونوں سڑک کنارے ایک
درخت کے نیچے بیٹھے نظر آئے۔

گرمی سے دونوں کی حالت بری ہو رہی تھی اور دونوں نڈھال
سے بیٹھے تھے۔ سمیرا نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور پانی کی
بوتل ان کی طرف بڑھائی جسے شکر کے ساتھ بوڑھے شخص نے قبول
کر لیا۔ پہلے اس نے اپنے پوتے کو پانی پلایا جو بہت کمزور اور
نڈھال سا تھا۔ پھر انہوں نے خود پانی پیا اور آسمان کی طرف دیکھ
کر شکر الحمد للہ کہا۔

”بیٹا! اللہ تمہیں اس کا اجر دے۔ ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔“

”ہاں پتر بولو.....“ بابا جی نے شفقت سے کہا۔

”بابا جی! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ لوگ اتنی مشکل میں ہیں۔ اپنوں کی جدائی کا دکھ بھی سہا اور یوں در بدر خوار بھی ہو رہے ہیں مگر اس کے باوجود آپ اور آپ کے پوتے کی زبان پر شکایت نہیں ہے بلکہ شکر گزاری ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“ یہ سن کر بابا جی مسکرا دیئے۔

”پتر یہ تو اپنے اپنے سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ بعض اوقات ہم محلوں میں رہ کر بھی، نہ شکری کی تپتی زمین پر ننگے پاؤں چلتے ہیں۔ دیکھو پتر! اگر ہم واقعات و حالات کو شکر گزاری کی نظر سے نہیں دیکھیں گے تو ساری زندگی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس کے اصل ذائقے سے محروم رہیں گے۔

شکر کرنا نہ آتا ہو تو اپنے پاس موجود ہر نعمت میں سے اس کا اصل ”ذائقہ“ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے ”پیاس“ لگتی ہے تو اس کو بجھانے کے لیے ہمارے پاس لاتعداد، بہت سے ذائقوں کی چیزیں موجود ہوں گی، مگر ”شکر“ نہ کرنے کے باعث ہم چیزوں پر چیزیں بدلتے ہیں مگر ہماری ”پیاس“ اپنی جگہ پر رہ جاتی ہے۔ یہی حال ”بھوک“ کا ہے۔ میز انواع و اقسام کی چیزوں سے بھرا ہوتا ہے مگر ہم ہر چیز میں نقص نکال کر، اسے رد کر کے اپنی ”بھوک“ کو سدا زندہ رکھتے ہیں جو پھر کسی چیز سے ختم نہیں ہوتی۔ بس پتر اپنے رب سے دعا کیا کرو کہ وہ سکھ گننا سکھلا دے۔ شکر کی نظر عطا کرے تو سب کچھ بہت آسان لگنے لگتا ہے۔“

بابا جی نے سمیرا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے پوتے کا ہاتھ تھام کر چل دیئے۔ آج سمیرا کو اپنے بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ شکر کی نظر کیا ہے، آج اسے سمجھ آیا تھا۔

اب اس نے غور کرنا شروع کیا تو اسے بہت سی باتیں سمجھ آنے لگی تھیں۔ اے سی والے ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر بھی سعدیہ بابا جی کا گرمی گرمی کا شور ڈالنا، رابیل اور احسن کا کھانے پینے کی ہر چیز پر ضد کرنا، بھلے وہ لوگ ہر حال میں سمیرا سے بہت بہتر اور آگے تھے مگر کیا ان کو احساس بھی تھا اپنے بہتر اور آگے ہونے کا؟؟ نہیں.....!! اس لیے کہ وہ اپنے پاس موجود آسائشوں پر

مطمئن اور شکر گزار نہیں تھے۔ جب یہ ہی بات سمیرا نے بابا جی عابدہ سے کہی تو وہ مسکرا دی۔

”مجھے خوشی ہے کہ تم نے بہت جلد اپنے سوال کا جواب پالیا ہے۔ بس اسی چیز کو اپنی زندگی کی بنیاد بنا لو۔ کبھی خود کو محروم نہیں پاؤ گی۔

دُکھ کی گنتی جانتا ہوں میں
سکھ گننا نہ آوے میں ناشکرا
میرے مالک.....! ایک توفیق دلا دے
سکھ گننا سکھلا دے.....!!

سکھ کی گنتی سیکھ جانے والے ہمیشہ اور ہر حال میں بہت خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ وہ بہتر جانتا ہے کہ کون سا بیج کس مٹی اور کس جگہ نمو پاتا ہے۔ خدائے ذوالجلال اسے وہی مٹی عطا کرتا ہے۔ زندگی میں آگے بڑھنے کی جدوجہد ضرور کرو مگر شکر کی نظر کے ساتھ تاکہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کا بھرپور مزہ اٹھا سکو۔“

بابا جی عابدہ نے کہا تو سمیرا نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ اب تک اس نے دکھوں کی گنتی کی تھی، اب اسے سکھ کی گنتی کرنی تھی جو اس نے آج ہی سے شروع کر دی تھی۔

ہاتھی

ہاتھی خشکی کا سب سے بڑا جانور ہے۔ افریقہ اور جنوبی ایشیاء کے ممالک، بھارت، برما اور بنگلہ دیش میں پایا جاتا ہے۔ ہاتھی کے جسم پر بال نہیں ہوتے۔ اس کی جلد صاف سیاہ ہوتی ہے۔ ہاتھی جنگلوں میں بڑے بڑے غولوں کی شکل میں رہتے ہیں۔ ہاتھی دو قسم کے ہوتے ہیں افریقی اور ایشیائی۔ ان میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے لیکن عادتیں اور خصوصیات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ افریقی ہاتھی ایشیائی ہاتھی کی نسبت بڑا ہوتا ہے۔ کان بھی زیادہ چوڑے ہوتے ہیں اور پیٹھ چوٹی ہوتی ہے۔ نر اور مادہ دونوں کے دانت باہر نکلے ہوتے ہیں۔ ہاتھی کا قد 11 فٹ اور ہتھنی کا 9 فٹ ہوتا ہے۔ اس کا وزن تقریباً 4 ٹن تک ہوتا ہے۔ ایشیائی ہاتھی کی پیٹھ پر کوہان ہوتا ہے۔ صرف ایشیائی ہاتھی کے دانت باہر نکلے ہوتے ہیں، ہتھنی کے نہیں۔ قد 8 فٹ تک ہوتا ہے اور وزن تقریباً ساڑھے تین ٹن۔ ایشیائی ہاتھی بوجھ ڈھونے اور سرکس کے لیے سدھایا جاتا ہے۔ ہاتھیوں کے دانت انہیں کھانے میں کوئی مدد نہیں دیتے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔ یہ دانت بے حد قیمتی ہوتے ہیں۔ ان سے بہت چیزیں بنائی جاتی ہیں جنہیں ہاتھی دانت کی چیزیں کہتے ہیں۔ ہاتھی کی اوسط عمر ستر سال ہوتی ہے۔ ہاتھی اپنا بدلہ ضرور لیتا ہے۔ ایک دن میں آدھا ٹن غذا اور 30 گیلن پانی پی لیتا ہے اور غذا کی تلاش میں 100 میل تک دُور چلا جاتا ہے۔

آپ بھی لکھیے



روشن چراغ

(محمد عمر، ننگانہ صاحب)

گرمیوں کی ایک اور شام ڈھلنے کو تھی۔ نیلگوں آسمان زرد سورج کو اپنی آغوش میں لینے کے لیے بے قرار تھا۔ چوہدری نور دین کی آبائی حویلی میں دوسرے دنوں کی طرح آج بھی خاصا ہجوم تھا۔ تمام افراد دن بھر کے تھکا دینے والے کام کاج کے بعد حویلی میں موجود برسوں پرانے شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور اس کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر ایک دوسرے کے ساتھ بحث و مباحثہ بھی کر رہے تھے اور ایک کرسی پر بیٹھا چوہدری نور دین جواب کافی بوڑھا ہو چکا تھا، حقے کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے یہ بات عیاں تھی کہ وہ کسی کا انتظار کر رہا ہے۔ اتنے میں حویلی کے دروازے سے گاؤں کے ماسٹر صاحب اپنے ایک طالب علم کے ساتھ نمودار ہوئے۔ چوہدری نے احترام اور دوستی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ماسٹر جی کو ”جی آیاں نوں“ کہا۔

آج سے تقریباً بیس سال پہلے جب ماسٹر جی بذریعہ ریل گاڑی گاؤں پہنچے تو انہوں نے پینٹ شرٹ زیب تن کی ہوئی تھی۔ جب گاؤں کے کتوں نے انہیں پینٹ شرٹ میں ملبوس پایا تو انہوں نے ان کو ولایت پہنچانے کا فیصلہ کیا، لیکن بھلا ہو اس بخشو کا جس نے کتوں کے ارادوں کو بھانپ لیا اور ”توئے توئے“ کی آوازیں نکالتے ہوئے کچھڑ سے لت پت ایک اینٹ سے کتوں کی تواضع کی۔ اس کے بعد بخشو نے ماسٹر جی کا نام پتا پوچھا اور ان کو سرکاری سکول پہنچایا۔ سرکاری سکول پہنچنے کے بعد بخشو نے ماسٹر جی کی

خدمت میں لسی پیش کی، جسے پینے کے بعد ماسٹر جی تو سو گئے مگر بخشو نے سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ گاؤں میں نئے ماسٹر جی آئے ہیں۔ اگلی صبح جب ماسٹر جی نے سکول کی گھنٹی بجائی تو کوئی لڑکا بھی سکول نہ آیا۔ ماسٹر جی نے چوہدری صاحب کے ڈیرے کا رخ کیا تاکہ ان کو صورت حال سے آگاہ کریں جب ماسٹر جی ڈیرے پر پہنچے تو بخشو نے چوہدری سے ان کا تعارف کروایا۔ چوہدری نے ماسٹر جی کا مسئلہ سننے کے بعد کہا۔ ”ماسٹر جی آپ فکر نہ کریں۔ یہاں کے لڑکے پڑھنا نہیں چاہتے۔ میں آپ کے لیے حویلی کا کمرہ صاف کروائے دیتا ہوں تاکہ آپ کو رہائش کی تکلیف نہ ہو اور اس کے علاوہ آپ کو کھانے اور تنخواہ کے متعلق بھی فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ آپ کو باقاعدگی سے ملتا رہے گا“ مگر چوہدری کی باتوں کا ماسٹر جی پر رتی بھر بھی اثر نہ ہوا۔ وہ تو پرلے درجے کے ڈھیٹ تھے چھین سے کہاں بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے گھر گھر جا کر تعلیم کے قصیدے پڑھنا شروع کر دیے جس سے دیہاتیوں کے دل پسینے گئے اور انہوں نے اپنے لڑکوں کو اسکول بھیجنا شروع کر دیا۔ آخر کار چوہدری کو بھی سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ وہ دن اور آج کا دن ماسٹر جی سے سینکڑوں لڑکوں نے تعلیم پائی۔

چوہدری صاحب کے اشارے پر ماسٹر جی اور ارسلان نامی اس طالب علم کے لیے کرسیاں لائی گئیں۔ ماسٹر جی کے زیر سایہ ہی ارسلان نے زانوئے ادب طے کیے تھے اور ارسلان اپنی فصاحت و بلاغت میں سارے گاؤں میں مشہور تھا۔ ماسٹر جی ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مجمع میں ملکی مسائل کا ذکر ہونے لگا۔ سب نے ان مسائل کا ذمہ حکومت کے سر تھوپ دیا۔ اس پر ارسلان بول اٹھا کہ تم لوگ مسائل کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہرا کر اپنی ذمہ داریوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہتے ہو۔ آپ حکومت کو قصور وار ٹھہرا کر خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے ایسے بیٹھے رہتے ہو جیسے اس ملک کا نظام خود بخود ہی درست ہو جانا ہے۔ ہم اپنے فرائض سے غفلت نہیں برت سکتے، ہمیں خود ہی ملک کا نظام ٹھیک کرنا ہوگا۔ اس مقصد کو ہم اسی وقت سرانجام دے سکیں گے جب ہم تعلیم حاصل کر کے اپنے اندر شعور پیدا کر لیں گے۔ عقل و شعور اس لیے ضروری ہے کیوں کہ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے ہم اپنے فرض سے آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ تعلیم سے ہم فرض شناس بنیں گے جس سے ہم اپنے آپ کو درست کر پائیں گے۔ اگر ہم اپنے آپ کو درست کر

لیں گے تو ہمارا نظام خود بخود ٹھیک ہو جائے گا تو پھر آپ کو اپنے حکمرانوں سے کوئی شکایت نہ ہوگی کیوں کہ وہ بھی تو آپ میں سے ہی منتخب ہوتے ہیں۔ اگر آپ آپس میں انصاف کا معاملہ کریں گے تو حکمران بھی آپ کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

”جو قوم جس طرح کی ہوتی ہے اس پر ویسا ہی حکمران مسلط کر دیا جاتا ہے۔“ اگر ہم تعلیم حاصل نہ کریں گے تو ہمارا نظام کبھی بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔

خدا نے کبھی اس قوم کی حالت نہیں بدلی

نہ ہو جس کو خیال اپنی حالت کے بدلنے کا

اس سنہری اصول پر عمل کرتے ہوئے ہمیں خود ہی کوشش کرنا ہوگی۔ ہمیں اپنے وطن کو تاریکیوں سے نکالنے کے لیے علم کے دیے روشن کرنے ہوں گے۔ ہمیں علم کی روشنی پھیلانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنا ہوگی: چاہے اس میں کتنی مشکلات ہی کیوں نہ آئیں۔

تندی بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب

یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

آزادی پاکستان کے وقت مسلمانوں نے جس قدر قربانیاں دیں اب ہمیں اتنی ہی قربانیوں کی ضرورت ہے تاکہ ہم اندھیروں سے اجالے کی طرف سفر کریں ہمیں اپنے پاکستان جیسے باغ کی آبیاری علم کی روشنی سے کرنی ہوگی۔ مجھے پتا ہے کہ میری اس تقریر پر کچھ عمل کریں گے اور کچھ نہیں، کیوں کہ جب ان لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ اپنے بیٹے کو تعلیم کیوں نہیں دلواتے تو کہتے ہیں ان کو پڑھانے کا کیا فائدہ۔ ان کو نوکریاں تھوڑی مل جانی ہیں۔ بھئی علم کا مقصد صرف نوکری کا حصول ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی اولاد جبری مشقت سے تنگ آ کر کلاشن کوف سے اپنا زہرا لگتے ہیں۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ پستول یا کلاشن کوف اٹھا لیں کیوں کہ پہلے ہی پاکستان کی گلیاں اور بازار گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور بم دھماکوں سے ویران ہو گئے ہیں۔ اگر ہم ان بچوں کے ہاتھ میں قلم تھا کر اس کا صحیح استعمال سکھا دیں تو یہی بچے پاکستان کی ترقی کا موجب بنیں گے۔ ہمیں اپنے بحری جہاز کے چھدرے ہوئے بادبان کو خود ہی پیوند لگانے ہوں گے اور اگر ہم غلط اقدام اٹھائیں گے تو اس میں اور زیادہ سوراخ ہو جائیں گے اور آخر کار ہمارا جہاز کسی بھنور میں پھنس کر سمندر کے بیچ و بیچ بے بس

ہو جائے گا لیکن ہم اپنی کوششوں سے یہ ثابت کر دیں گے کہ ہم اپنے وطن کو علم کی روشنی سے منور کر کے اسے دن دگنی رات چگنی ترقی دیں گے۔ تو آؤ ہم عہد کریں کہ ہم علم کی روشنی گھر گھر تک پہنچائیں گے، خواہ اس سفر کے راستے میں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ آجائیں، جس طرح ماسٹر جی نے اپنی کوششوں سے گاؤں میں علم کا پرچار کیا اور گاؤں کو علم کے چراغ سے منور کر دیا۔ اب ماسٹر جی نے تو اپنا کام پورا کیا۔ اب ہمیں چراغ سے چراغ جلانا ہوگا۔ اس پر پورے ہجوم نے یکجا ہو کر کہا۔ ان شاء اللہ!

(پہلا انعام: 120 روپے کی کتب)

نیا عزم

(نائب قریشی، ملتان)

وہ تاروں بھرے نیلے آسمان تلے لیٹا گہری سوچوں میں مگن تھا۔ یہی سوچیں اس کو بیس سال پیچھے لے گئیں۔ ”یہی گھر تھا، یہی آنگن، یہی درخت اور یہی پلنگ تھا۔ البتہ تب نیا تھا اور اب بالکل بوسیدہ ہو گیا تھا۔ اسی پلنگ پر بیٹھ کر ماں نے آنسو بہائے تھے اور شاید دل کی زبان سے ایسی بددعا دی تھی جس نے مجھے تنہا اور میری زندگی کو اجیرن کر دیا۔ آج میری ماں کو اس دنیا سے گئے پندرہ سال ہو گئے ہیں۔“

پھر اچانک پندرہ سال پہلے کہے گئے ماں کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔ ”بیٹا! ہم نے تمہیں بڑے لاڈ پیار سے پال کر اتنا بڑا کیا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے والد کی وفات کے بعد میں نے بچوں کا پیٹ کس مصیبت سے پالا ہے..... اب میرے بوڑھے اعضاء نے جواب دے دیا ہے، مجھ میں مزید لوگوں کے گھروں میں کام کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ اب چونکہ تم اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہو اور ماشاء اللہ تمہارے نکاح کی سنت بھی ادا ہو چکی ہے، لہذا چھوٹے بہن بھائیوں کا تم پر حق ہے کہ اولاد کی طرح ان کا خیال رکھو۔“ کتنا پیار تھا۔ کتنی التجائیت تھی ان الفاظ میں..... مگر..... مگر میں نے طیش میں دھاڑ کر ماں کو ایسی بات کہی جو ماں کے سینے کو چیرتی چلی گئی۔ آہ..... میں نے یہ بھی خیال نہ کیا کہ میں اپنی بیوی کے سامنے ماں سے ہتک آمیز سلوک کر رہا ہوں۔ شاید میں اپنی بیوی پر اپنا رعب جھاڑنے کے لیے ماں کی بے عزتی کر رہا تھا۔ ”یہ آپ کی اولاد ہے..... بھلا ان کا میرے اوپر کیا حق.....؟“

یہ کہتے ہوئے میں نے گردن کو جھٹکا بھی دیا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا جس دوران ماں نے مجھے ایسی بددعا دی جو آسمان کے تمام پردوں کو پرے دھکیلتی ہوئی سیدھی عرش خداوندی تک جا پہنچی۔ مجھے یقین ہے ماں نے مجھے بے اولاد رہنے کی بددعا دی ہوگی۔ میری شادی کو بیس برس گزر گئے مگر میں اولاد کی نعمت سے محروم ہوں جب کہ تینوں چھوٹے بہن بھائی صاحب اولاد ہیں اور نہایت مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں۔

رات کی تاریکی پھیلتی جا رہی تھی اور سوچ کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ میری بیوی تو ماں کے سامنے ہی اس اجیرن زندگی سے تنگ آ کر میکے چلی گئی تھی..... شاید اس وقت سے ہی میری بربادی کے دن شروع ہوئے تھے..... میرے تو بڑھاپے کا بھی کوئی سہارا نہیں..... کاش میں اپنی بوڑھی ماں کا سہارا بنتا تو آج میرا بھی کوئی سہارا ہوتا۔ اے خدا! مجھے موت دے دے۔ میرا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ تیز ہوا اب آندھی میں تبدیل ہو چکی تھی۔

وہ ان خیالات کو جھٹکنا چاہ رہا تھا لیکن پھر ماں کے وہی الفاظ اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہے تھے۔ اب تو وہ انتہائی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ ہادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی گرج دار چمک میں ماں کی آواز مزید بلند ہوئی کہ بھیانک ہوتی جا رہی تھی..... جو ماحول کو اور زیادہ وحشت انگیز اور پراسرار بنا رہی تھی۔ وہ سمٹ سمٹ کر بوسیدہ پلنگ میں اپنا منہ گھسا رہا تھا لیکن خوف ناک آواز گھر کے گوشے گوشے سے دہری ہو کر کانوں میں سے گزر کر سارے بدن میں سرایت کرتی جا رہی تھی۔

”تمام گناہوں میں سے والدین کی نافرمانی ایک ایسا گناہ ہے جس کی سزا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی ضرور ملتی ہے۔“ امام صاحب کے وہ الفاظ اسے یاد آئے جو ایک دن جمعہ کے خطبے کے دوران اس نے سنے تھے۔

”ماں..... میری ماں..... مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔“ اس نے ماں کی آواز سے کہا۔

”اے خدا مجھے ایک موقع اور دے دے تاکہ میں اپنی ماں کو مناسکوں سے راضی کر سکوں۔“ اب تو وہ سسک رہا تھا اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اٹھ رہا تھا۔ پھر اچانک کسی نے اسے اپنی بانہوں میں لے کر اس کی پسینے سے شرابور پیشانی پر بوسہ دیا۔

”کیا ہوا میرے بچے؟“ اس نے بدحواسی کے عالم میں

آنکھیں کھولیں اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے اس کی مہربان اور شفیق ماں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”ماں..... میری ماں..... مجھے معاف کر دو..... مجھے معاف کر دو۔“ یہ باتیں اس کی ماں نے سن لی تھیں جو شاید اس کی دعا کی قبولیت کی نوید تھی۔

”ہاں..... ہاں میں نے تمہیں معاف کر دیا۔“ ماں نے فراخ دلی سے کہا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور اپنی اس ماں کے قدموں میں گر گیا جس نے تہجد سے فجر تک خدا کے حضور گڑگڑا کر اپنے نافرمان بیٹے کے لیے دعا مانگی تھی۔ پھر وہ خدا کے حضور سر بسجود ہونے کے لیے ایک نئے عزم کے ساتھ اٹھا جس نے ایک خواب کے ذریعے وقت سے بہت پہلے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔

(دوسرا انعام: 100 روپے کی کتب)

محنت میں عظمت

(طوبیٰ وحید، ہری پور)

”امی، ہم گھر شفٹ کر رہے ہیں۔ بس اب ہم یہاں اور نہیں رہیں گے۔ میں یوں اکیلے رہ کر تنگ ہو گیا ہوں۔ نہ گھر میں کوئی دوست نہ محلے میں کوئی دوست، یہ کیا بات ہوئی۔ ہمارے گھر کے آس پاس کوئی ایسا نہیں ہے جس سے میں پڑھائی میں کوئی مدد لے سکوں۔ کوئی بات کر سکوں، کچھ کھیل سکوں۔“ یہ سب الفاظ طلحہ نے کہے تھے جو غصہ میں آ کر اپنی امی سے کہہ رہا تھا۔

دراصل طلحہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے گھر میں تمام آسائشیں موجود تھیں مگر اس کے گھر کے نزدیک اس کا کوئی دوست نہیں رہتا تھا جس کی وجہ سے اسے اپنے والدین سے سخت شکایت تھی۔ اس کے والدین کو بھی اس بات کا احساس تھا مگر وہ اتنا بڑا گھر چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاسکتے تھے۔

حمزہ ایک بہت ہی نیک اور شریف لڑکا تھا۔ اس کے والد اس کے بچپن میں ہی وفات پا گئے تھے۔ حمزہ کی والدہ لوگوں کے گھروں میں کام کرتیں اور دو وقت کی روٹی کا بندوبست کرتیں مگر دودن پہلے ہی حمزہ کی والدہ کی نوکری چھوٹ گئی تھی۔ وہ جہاں کام کرتی تھیں وہ فیملی کسی اور شہر چلی گئی تھی۔

اب حمزہ کی والدہ روز کام کی تلاش میں مختلف گھروں کے چکر

کاٹیں۔ ابھی ان کی پچھلی نوکری چھوٹے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ انہیں ایک شان دار بنگلے میں نوکری مل گئی مگر یہاں کام زیادہ تھا جس کی وجہ سے انہیں سرونٹ کوارٹر میں شفٹ ہونا پڑا۔

یہ بنگلہ طلحہ لوگوں کا تھا اور جب اسے حمزہ کا پتا چلا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اسے ایک دوست مل گیا تھا۔ حمزہ کو بھی طلحہ سے مل کر کافی خوشی ہوئی۔ اب وقت گزرتا گیا۔ طلحہ نے اپنے والدین سے کہہ کر حمزہ کا داخلہ بھی اپنے اسکول میں کروا لیا۔ اب وہ اکٹھے اسکول جاتے، شام میں بھی اکٹھے کھیلتے اور رات میں ہوم ورک بھی ایک ساتھ کرتے۔ ابھی ان کو ملے ایک مہینہ ہی ہوا تھا مگر وہ بہت گہرے دوست بن چکے تھے۔

اگر طلحہ کو حمزہ سے دوستی میں مسئلہ تھا تو وہ صرف ایک بات کا وہ چاہتا تھا کہ حمزہ پڑھائی میں اس سے کبھی آگے نہ نکلے مگر حمزہ تھا کہ دن رات محنت کرتا اور ہر ٹیسٹ میں اوّل آتا۔ تمام استاد حمزہ سے بہت خوش تھے مگر طلحہ کو نا جانے دن بہ دن کیا ہوتا جا رہا تھا۔ اب تو وہ حمزہ کو خود سے آگے دیکھ کر جلتا تھا۔ اس نے دماغ میں یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ امتحانات میں کچھ بھی کرے گا مگر حمزہ کو اوّل آنے نہیں دے گا۔ ویسے بھی امتحانات سر پر تھے۔ طلحہ کے دماغ نے اس سے زیادہ کام نہ کیا کہ اس نے حمزہ کے بیگ سے انگریزی کی کتاب چوری کر لی تاکہ وہ تیاری نہ کر سکے اور وہ اوّل پوزیشن حاصل کر لوں، مگر حمزہ نے طلحہ کو کتاب چوری کرتے دیکھ لیا۔ اسے

بہت دکھ ہوا لیکن اس نے طلحہ سے کوئی ذکر نہ کیا۔

سارے پرچے خیریت سے گزرتے گئے، کل آخری پرچہ تھا۔ حمزہ نے تمام پرچوں میں بہت محنت کی، ویسے بھی اس نے پہلے سے سب تیاری کی ہوئی تھی اس لیے اسے زیادہ تیاری کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔

حمزہ جب صبح اسکول وین میں جا بیٹھا تو اس نے دیکھا تو طلحہ آج نہیں آیا تھا، اسے یہ دیکھ کر کافی پریشانی ہوئی مگر فی الحال وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

حمزہ اسکول سے واپس آیا تو سیدھا طلحہ کے کمرے میں اس کی خیریت دریافت کرنے گیا۔ اسے طلحہ نے بتایا کہ کل رات ہی اس کا پیر پھسل گیا تھا جس کی وجہ سے فریکچر ہو گیا ہے۔ طلحہ اپنی بات پوری کرتے ہی رونے لگا، اس نے حمزہ کو ساری بات بتائی اور اس سے معافی مانگی، طلحہ یہ جان چکا تھا کہ محنت میں عظمت ہے۔ اگر وہ بھی محنت کرتا اور چوری نہ کرتا تو اسے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ حمزہ نے طلحہ کو یہ نہ بتایا کہ وہ یہ سب جانتا تھا کہ اسے اور پریشانی ہوگی مگر طلحہ رزلٹ دیکھنے کے بعد یہ بات بھی جان گیا۔ اس بار حمزہ کو اوّل دیکھ کر طلحہ بھی بہت خوش تھا۔ اور اپنی آئندہ زندگی کے لیے بھی اسے اپنا بہترین دوست منتخب کر چکا تھا۔

(تیسرا انعام: 80 روپے کی کتب)

”کھوج لگائیے“ میں حصہ لینے والوں کے نام

رداعدیل، لاہور۔ عروج نوید، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ شمر خان، بھکر۔ شوال فاطمہ، شیخوپورہ۔ بلال احمد، حسن ابدال۔ عیشہ عتیق احمد، لاہور۔ عبدالمعیز، گوجرانوالہ۔ حنا مجاہد، فیصل آباد۔ غاصیہ صابر، لاہور۔ فاطمہ حسین فیضی، سرگودھا۔ اذلان ہارون، نوشہرہ۔ ماہم امجد، راول پنڈی۔ محمد کلیم، بھکر۔ مشعل احمد، گجرات۔ عاصم طفیل، گوجرانوالہ۔ محمد عیسیٰ، کلور کوٹ۔ بسام شفیق بھٹی، لاہور۔ محمد علی عمران، لاہور۔ عرتج ذوالفقار، لاہور۔ محمد عبداللہ نیازی، بھکر۔ محمد نعیم امین، لاہور۔ صفا شفاق، لاہور۔ محمد عمر اقبال، کراچی۔ فاطمہ الزہرہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔ ناعمہ تحریم، کراچی۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد حبیب الرحمن، اسلام آباد۔ آمنہ علی، اسلام آباد۔ عائشہ کریم، ملتان۔ مہوش علی، خوشاب۔ عمیمہ بابر، سیال کوٹ۔ مریم جاوید، لاہور۔ علیشہ ادریس، کراچی۔ محمد عثمان علی، جھنگ صدر۔ نازیہ ندیم، راول پنڈی۔ محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ منزل آصف خان، کراچی۔ محمد احمد جواد گل جگنو، چشتیاں۔ محمد شیراز، گوجرانوالہ۔ احمد فرید خان، چکوال۔ نور محمد، کراچی۔ عامر سہیل، بھکر۔ محمد فیاض الحسن، چکوال۔ سعد حسن، اسلام آباد۔ علی رضا، سیال کوٹ کینٹ۔ وانیہ شیخ، سندھ۔ محمد ہاشم اسلم، گوجرانوالہ۔ عیثا افضل، گوجرانوالہ۔ ہدی بنت اخلاق، اسلام آباد۔ بلال ذوالفقار سلیمانی، کراچی۔ عبداللہ بن نعیم، جہلم۔ نادر علی محمد رشید، کراچی۔ تحریم مریم شاہد، ملتان۔ محمد ریان احمد، اسلام آباد۔ محمد ابو ہریرہ، علی پور چٹھہ۔ شرجیل انجم ڈوگر، کمالیہ۔ شفق فاطمہ، اسلام آباد۔



راجو

جاتا۔ اس کے پاس سوائے منہ بسور کر واپس جانے کے اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

”کیوں ہوتے ہیں امیر لوگ! اس طرح کے۔“ وہ بے چارگی سے سوچ رہا تھا۔ ”ہم غریب لوگوں کو کیوں یہ چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دیتے ہیں۔“

اس کی سوچوں کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ تھکے قدموں سے اپنی اگلی منزل کی جانب روانہ تھا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی تھی اور اب تک دس روپے کی آمدنی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اُسے کبھی بھی اس انداز سے کام کرنے کی عادت نہ تھی، وہ تو بڑے اطمینان سے پڑھائی میں مصروف تھا۔ میٹرک اے گریڈ سے پاس کرنے کے بعد اُسے کالج والوں نے داخلے کے لیے بہ خوشی قبول کر لیا تھا۔ فارم لے کر خوشی خوشی وہ گھر پہنچا۔ وہ اپنے والد کو یہ خبر جلد از جلد دینا چاہتا تھا کہ اُن کے بیٹے کا داخلہ اُس کالج میں ہونے جا رہا تھا جس میں داخلے کا ہر طالب علم خواہش مند رہتا تھا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ اس کی یہ خوشی ادھوری رہنے والی ہے۔

وہ اُداس سی صورت بنائے کھڑا تھا۔ جانے اس انداز سے کھڑے اُسے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ اب کافی وقت گزر چکا تھا، اُس نے سر پر ہاتھ پھیر کر کچھ سوچا اور پھر دروازے پر لگی گھنٹی بجا دی۔ چند ساعتوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک کھوسٹ سا بوڑھا باہر نکلا۔ اُسے دیکھتے ہی جیسے اس کے اندر کا مزاج ایک دم گرم ہو گیا۔

”تم اب تک گئے نہیں یہاں سے!“ اس کی شعلہ بار آنکھوں نے اسے دہلا کر رکھ دیا۔

”مگر... آپ کی طرف سے جواب نہیں ملا تھا۔“ اُس نے قدرے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”ابے تو کیا تمہیں یہاں سے جانے کے لیے لکھ کر درخواست کریں۔“ چاچا خاصا غصیلہ آدمی تھا۔ ”دفع ہو جاؤ۔“

وہ ابھی کچھ اور کہنے کے موڈ میں تھا لیکن اگلا حملہ منہ سے نہیں بل کہ ہاتھوں سے کیا گیا۔ اُسے باقاعدہ دھکا دیا گیا تھا۔ وہ تو شکر کہ اس نے اپنا توازن برقرار رکھا ورنہ وہ سیڑھیوں سے لڑھک

گھر پہنچا تو اُسے علم ہوا کہ اس کے والد اب تک فیکٹری سے نہیں آئے۔ اُس کا گھر انہ کل چھ افراد پر مشتمل تھا اور اس کے واحد کفیل اس کے والد تھے۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کی تین بہنیں راجو سے چھوٹی تھیں، وہ بھی حصول علم میں مصروف تھیں۔ اس کی والدہ اکثر بیمار رہتی تھیں جس کے علاج کے اخراجات بھی اس کے والد کے ناتواں کاندھوں پر تھے۔ وہ اکثر فیکٹری میں اور ٹائم لگا کر اپنی آمدنی بڑھا لیتے تھے تاکہ گھر میں کسی کو کوئی دشواری نہ ہو۔

راجو نے میٹرک کے امتحانات کے بعد سرسری طور پر ان کا ہاتھ بٹانے کے بارے میں ابو سے بات کی تو انھوں نے اُسے سختی سے ڈانٹ دیا تھا۔

”ابھی میں زندہ ہوں راجو میاں! تمھاری عمر پڑھنے لکھنے کی ہے! کام کاج تو پھر ساری زندگی چلتا رہے گا۔“

اپنے ابو کے یہ اُمید افزا جملے سن کر اس کا سیروں خون بڑھ چکا تھا۔

”کتنے اچھے ہیں میرے ابو!“ وہ اکثر سوچا کرتا۔ اپنے ابو کے انتظار میں بیٹھا سوچنے لگا کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن چکا ہے اور اپنے والدین کی بڑی خدمت کر رہا ہے۔ اس کی سوچوں کا سلسلہ اس وقت تھا جب اس کی والدہ نے اُسے آواز دی۔ ”راجو! بہت دیر ہوگئی، اپنے ابو کا پتا تو کرو، وہ اب تک کیوں نہیں آئے؟“

”امی! لگتا ہے آج پھر اور ٹائم لگ گیا ہے۔“ اس نے گھڑی کی طرف نظریں اٹھا کر اپنا اندازہ پیش کیا۔ شام کے سات بج چکے تھے۔ وہ پانچ بجے فارغ ہو کر چھ سے پہلے ہی گھر پہنچ جاتے تھے۔

”اگر اور ٹائم کرتے تو چاچا بشیر کو اطلاع تو کرتے۔“ وہ تشویش بھرے لہجے میں بولیں۔

”ہو سکتا ہے بھول گئے ہوں۔“

”تم پتا کرو، میرا دل ہولا جا رہا ہے۔“ اس کی والدہ کمزور دل کی مالک تھیں اسی لیے کسی اُن جانے خوف کا شکار تھیں۔

اکثر فیکٹری میں رکنے پر اس کے والد فیکٹری سے اپنے پڑوسی کے موبائل پر اطلاع کر دیتے تھے تاکہ وہ مطمئن رہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ انھیں یاد نہ رہا ہو یا چاچا بشیر کسی بچے کو بھیجنا بھول گئے ہوں۔ امی کے اطمینان کے لیے وہ اٹھا اور چاچا بشیر کی

طرف چلا۔ اُسے بھی تو اپنے ابو کو خبر سنانے کی جلدی تھی۔

چاچا کے پاس جا کر اسے علم ہوا کہ فون نہیں آیا۔ چاچا کے فون میں اس کے ابو کی فیکٹری کا نمبر تھا۔ جب وہاں فون کیا گیا تو ایک روح فرسا خبر ان کی منتظر تھی۔ فیکٹری کا بوائکر اچانک پھٹ گیا تھا۔ کئی افراد زخمی ہو گئے تھے۔ وہ ایک دم سن سا ہو گیا، خبر ہی ایسی تھی کیوں کہ اس کے والد ہی تو بوائکر آپریٹر تھے۔ جانے کیسے تیسے وہ اس اسپتال پہنچا جہاں فیکٹری والوں نے زخمیوں کو بھیجا تھا۔ وہ اپنے پیارے والد کی سلامتی کے لیے دُعا میں کرتا ہوا وہاں گیا تو اس کی تمام اُمیدیں بجھ سی گئیں۔ اُس کے والد ہی سب سے زیادہ زخمی تھے۔ ان کے سر کا اگلا حصہ متاثر ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ دماغ تک باہر آ گیا ہے۔ ایمرجنسی آپریشن کر رہے ہیں لیکن امکانات کم ہی ہیں۔

اگلے لمحات میں کیا ہونے والا ہے کسی کو معلوم نہ تھا۔ وہ تو انھیں خوشی کی خبر سنانا چاہ رہا تھا اور وہ خود اخبارات کی خبر بن چکے تھے۔ اگلے دن کے اخبارات میں بوائکر پھٹنے سے ۱۷ افراد کے زخمی اور ۱۳ افراد کی ہلاکت کی خبر چھپی تھی۔ ان تین افراد میں راجو کے والد کا نام سرفہرست تھا۔ تمام دوست احباب اور رشتے داروں نے اس ناگہانی موت پر اُن کے ساتھ خوب خوب تعزیت کی اور ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا۔ اس کے والد کی فیکٹری سے مینجر بھی تعزیت کے لیے آئے اور خوب دلاسا دے کر گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مالکان کو ان کے گھرانے کے واحد کفیل کی اچانک موت کا بے حد دکھ ہے۔ سیٹھ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس کے اٹھارہ سال ہونے پر اپنے باپ کی جگہ ملازمت دے دیں گے اور یہ بھی کہ اس کے بالغ ہونے تک فیکٹری ہر ماہ ان کی باقاعدہ مدد کرتی رہے گی۔

اگلے تین دنوں کے بعد زندگی معمول پر آگئی۔ کیسی موت اور کیسا ساتھ۔ جب پہلی تاریخ کو وہ فیکٹری پہنچا تو اسے چار پانچ چکر لگوا کر دس تاریخ کو پانچ ہزار روپے دیے گئے۔ اس کی والدہ نے اسے ہی غنیمت جانا اور گھر کے راشن کے انتظامات کر لیے۔ اس کے والد ہوتے تو وہ کالج کی فیس کی بات بھی کرتا، اب تو یہ کسی طور ممکن نہ تھا۔ اس کی والدہ نے برسوں سے بند پڑی سلائی مشین نکال کر اس کی سروس کرائی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بچے کسی پریشانی کا شکار ہو جائیں۔ اب راجو کے لیے بھی لمحہ فکریہ



تھا۔ اس کی غیرت کس طرح گوارا کرتی کہ اس کی ماں بیماری میں لوگوں کے کام کرتی پھرے اور وہ نکما رہے، اس نے سنجیدگی سے کام کے بارے میں سوچنا شروع کیا اور دوستوں سے صلاح مشورے شروع کیے۔

اسے کپڑے دھونے والے پاؤڈر کی سیل کا کام ملا۔ بہ ظاہر تو ٹکمپنی کی آفر پر کشش تھی لیکن کام کی تنگی کا اندازہ اس وقت ہوا جب اس نے کام شروع کیا۔ سارے دن کی جدوجہد کے بعد سو، سو سو روپے بنتے اور اس میں ذلت بھی ساتھ ہوتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اس کام سے عاجز آچکا تھا لیکن کوئی اور کام اس وقت اس کے لیے موجود بھی نہ

تھا۔ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے؟ یہ سوچ اس کے لیے بے حد اہم ہو گئی تھی اور راستا تھا کہ سنجائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک تو پڑھائی سے دوری نے اس کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا دوسری جانب سیلز مینی کے دوران پیش آنے والے واقعات نے اس کے اندر آگ بھردی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ سوچتا کہ اگر میرے پاس اسلحہ ہو تو ایک ایک سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں لیکن اے کاش! کہ میں کچھ کر سکتا۔ تمام باغی سوچوں کے باوجود وہ ایک اچھا لڑکا تھا۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا اور سوچتا کہ کبھی تو اس کی قسمت بھی بدلے گی اور وہ اپنے دوستوں کی طرح کالج جائے گا اور پڑھ لکھ کر قابل فرد بن جائے گا لیکن وہ لمحہ کب آئے گا؟ مسلسل ناکامیوں نے اسے بالکل ہی سر پھرا کر دیا تھا۔ اب وہ سنجیدگی سے کوئی منفی قدم اٹھانے کو تیار تھا۔ وہ گھر سے کوئی ارادہ کر کے چلا تھا۔ مختلف سڑکوں سے ہوتا ہوا وہ ایک جگہ پہنچا۔ کچھ دیر اس نے فٹ پاتھ پر رک کر کچھ سوچا اور پھر اچانک ہی سامنے سے آتی ایک تیز رفتار کار کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ

ہوا میں بلند کیے تھے۔ کار کے ہائیڈرالک بریک تیزی سے چر چرائے اور گاڑی عین اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر جام ہو گئی۔ ”اے لڑکے! پاگل ہو گئے ہو کیا؟“

ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔ وہ اپنے حواس بہ حال کیے کھڑا تھا۔ ”میں بالکل ہوش میں ہوں۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”تو پھر تم نے گاڑی کے نیچے آنے کی کوشش کیوں کی؟“ وہ سخت لہجہ میں بولا۔

”میں کسی بھی حال میں سیٹھ صاحب سے ملنا چاہتا تھا۔“ اس نے انتہائی سادگی سے کہا۔ اس کے اس جملے پر گاڑی کی کچھلی سیٹ پر بیٹھے آدمی کو کچھ احساس ہوا۔

”تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو اور اس کے لیے یہ بھونڈا طریقہ کیوں اختیار کیا....!“ وہ گاڑی سے باہر آ کر بولے۔

”جب غریب کی نہ سنی جائے اور اسے ٹھکرایا جائے تو پھر ایسا طریقہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔“ وہ اداسی سے بولا۔

”مگر تم ہو کون لڑ کے!“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”میں آپ کی فیکٹری کے ایک ورکر کا بیٹا ہوں۔“ اس نے

کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟“ اس نے

ہاتھ کے اشارے سے اس سے سوال کیا۔

”میں اس بوائے کو آپریٹر کا بیٹا ہوں جو آپ کی فیکٹری میں....“

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں شدت غم سے چھلک پڑیں۔

”اوہ! ٹھیک ہے تم ادھر گاڑی میں آ جاؤ، میں تمہاری بات

اطمینان سے سنتا ہوں۔“ انھوں نے پیار بھرے لہجے میں کہا تو اس

نے ان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔

گاڑی سیٹھ صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ اسے عزت سے

بٹھایا گیا۔ چائے بسکٹ سے تواضع کی گئی۔ کچھ دیر میں سیٹھ صاحب

آگے۔

”ہاں لڑ کے! اب کہو۔“

کچھ ہی دیر میں اس نے اپنا تمام غم بیان کر دیا۔

”میرے والد آپ کے کام کے دوران اپنی جان سے چلے

گئے اور ہمیں کیا ملا، در در کی ٹھوکریں۔“ اس کی آنکھیں ایک بار پھر غم

ہو گئیں۔ اس کے جذباتی انداز نے سیٹھ صاحب کو بھی متاثر کر دیا۔

”تم نے اچھا کیا جو مجھ سے مل لیے۔“ وہ اچھے دل کے

مالک تھے اس لیے انھوں نے اس کی بات پر توجہ دی۔ ”میں نے

مینجر کو مکمل تن خواہ دینے کی ہدایات کی تھی، مجھے نہیں معلوم کہ اُس

نے ایسا کیوں کیا۔ بہر حال!“

”ٹھیک۔“

”تم کھانا کھاؤ، میں اسے یہیں بلواتا ہوں۔“

”میں آپ کا بے حد شکر گزار رہوں گا۔“

”ہمارے پاس جو کچھ ہے اللہ کا دیا ہوا ہے اور پھر تمہارے

والد تو ہماری فیکٹری کے لیے ان تھک محنت کرتے تھے۔“ انھوں

نے نہایت انکساری سے کہا۔ وہ سیٹھ اچھے دل کے مالک تھے۔

اسے خیال آیا کہ وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چلا تھا لیکن اس نے

اپنے حق کے لیے جدوجہد کرنے کی ٹھانی اور کام یاب ہوا۔

سیٹھ علی حسن صاحب نے مینجر کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور انھیں

خوب ڈانٹ پلائی کہ انھوں نے ان کے احکامات کی تعمیل کیوں نہیں

کی؟ وہ بڑے شرمندہ ہوئے لیکن راجو کو کھانا جانے والی نظروں سے

دیکھ رہے تھے۔ اگر انھیں موقع ملتا تو شاید وہ اسے کچا ہی چبا جاتے۔

”تمہارے ساتھ جو زیادتی ہوئی اس کی تلافی کے طور پر اب

تمہارے تعلیمی اخراجات بھی فیکٹری ادا کرے گی۔“

وہ بے نیازی سے کہہ رہے تھے۔

”میں آپ کا شکریہ کس منہ سے ادا کروں۔“ وہ ان کی جانب

مشکور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

”اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں!“

”آپ نے میرے لیے آسانی پیدا کی، میں نہیں چاہتا کہ گھر

بیٹھے بالکل مفت کی توڑوں، میں اقبال کی امنگوں کا ترجمان بننا

چاہتا ہوں۔“ وہ جذباتی انداز سے کہہ رہا تھا۔ ”میں چاہوں گا کہ

شام میں چار گھنٹے مجھ سے کمپیوٹر پر کوئی کام لیا جائے تاکہ میرے

دل کی تسلی بھی رہے اور میں آئندہ سال جاری ہونے والی اپنی

جاب کی تیاری بھی کر سکوں۔“

سیٹھ صاحب تو نہیں چاہتے تھے کہ اسے وقت سے پہلے کام

پر لگائیں لیکن اس کی ضد کے آگے انھوں نے ہامی بھر لی۔ اب

جب وہ ان کے بنگلے سے روانہ ہوا تو اپنے بہتر مستقبل کے حوالے

سے بے حد پُر امید تھا۔ چند گھنٹوں قبل جو زندگی اُسے بوجھ معلوم

ہونے لگی تھی، اب اس کے لیے بے حد حسین ہو گئی تھی۔

☆☆☆

خلاصہ

قرآن کی سب سے پہلی سورۃ جو سورۃ الحمد بھی کہلاتی ہے۔ اس میں

سات آیتیں اور ایک رکوع ہے اور بمقابلہ دوسری سورتوں کے یہ پوری

سورت دُعا ہے۔ قرآن پاک میں اس کو بار بار پڑھنے کی ہدایت کی گئی

ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کو نماز کی ہر رکعت میں پڑھا جاتا ہے۔ سورۃ فاتحہ

کے برکات حدیث نبویؐ میں بکثرت مذکور ہیں۔ اسے ام القرآن بھی کہا

جاتا ہے۔ یہ مکہ اور مدینہ میں دو مرتبہ نازل ہوئی۔ عرف عام میں فاتحہ

ان سورتوں کے پڑھنے کو بھی کہا جاتا ہے جو کسی بزرگ یا مردہ کی روح کو

ایصالِ ثواب کے لیے پڑھی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی غریبوں کو کھانا

بھی تقسیم کیا جاتا ہے۔



☆ محمد فیاض! آپ اس رسالے میں بھرپور طریقے سے حصہ لیں۔ ہمیں آپ کی دوبارہ شمولیت سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ آپ کی خیریت نیک مطلوب ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہانوں کی خوشیاں عطا فرمائے۔ اس ماہ کا رسالہ پڑھا، بہت مزہ آیا۔ کہانیاں دلچسپ اور سبق آموز اور بے شمار معلوماتی خزانہ تھیں۔ میں رسالے میں کچھ نہ کچھ لکھ کر بھیجتا رہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شائع کیوں نہیں ہوتا یا آپ کے معیار پر پورا نہیں ہوتا۔

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

☆ ڈیر محمد احمد! آپ کی تحریریں اچھی ہیں لیکن تھوڑا سا انتظار کیجئے، ضرور شائع کریں گے۔

میں مختصر مختصر اور معلومات عامہ بھیج رہی ہوں۔ اس دفعہ ضرور شائع کیجئے گا، ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ میں پہلے ہی بہت ساری بھیج چکی ہوں لیکن شائع ہی نہیں ہوتا۔ (مہر سعید، گوجرانوالہ)

☆ ڈیر اور سویٹ مہر! آپ کی تحریریں باری آنے پر ضرور شائع ہوں گی، دل چھوٹا مت کریں۔

امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ آپ کو نیا سال مبارک ہو۔ جنوری کا شمار سپر ہٹ تھا۔ مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے ماموں والی فائی شائع نہیں کی لیکن ذائقہ کارنر دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہوا۔ سلسلہ مختصر مختصر کی داد دینی پڑے گی۔ فردری میں میرے پنجم کے بورڈ کے امتحان ہیں۔ میرے لیے دعا کیجئے گا۔ میری لکھائی اچھی ہے یا نہیں، ضرور بتائیے گا۔ (دابہہ تنویر، سیال کوٹ)

☆ پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی لکھائی بہتر ہے لیکن ذرا سی اور توجہ دیں تو بہترین ہو سکتی ہے، شاباش! امتحان کی کامیابی کے لیے دعائیں۔

میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ کی طرح رسالہ بہت اچھا رہا۔ میں نے پہلے بھی خط لکھا تھا، آپ نے شائع نہیں کیا۔ (سیال رحمت، واہ کینٹ)

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ عبدالسلام صاحب، ظہیر صاحب، سعید لخت صاحب، محمد بشیر صاحب اور پیاری بابی عابدہ اصغر کو نیا سال مبارک ہو۔ تعلیم و تربیت بہت اچھا رسالہ ہے۔ سب سے پہلے یہ رسالہ میرے ماموں جان محمد بلال نے لے کر دیا تھا۔ میرے امتحانات کے لیے دعا کیجئے۔

(محمد حسین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

☆ اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں کامیاب کرے۔

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

میرا نام یمنی حسین ہے۔ دوسری جماعت کی طالبہ ہوں۔ دو سال سے باقاعدگی سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ آج پہلی مرتبہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ چچا تیز گام اچھا سلسلہ تھا جسے شاید ختم کر دیا گیا ہے۔ ترکیب، سونے کا تاج، پانی پانی جسم اچھی لگیں جس کے لیے تمام رائٹرز تعریف کے مستحق ہے۔ (یمنی حسین، کراچی)

☆ پیاری یمنی! آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ آپ کی شمولیت سے ہمیں بہت خوشی ہوئی ہے۔

میں آپ کا نیا قاری ہوں۔ جنوری کا شمار سپر ہٹ تھا۔ میں نے دماغ لڑاؤ، سوال یہ ہے کہ اور کھوج لگائیے میں حصہ لیا ہے۔ میگزین ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ ہر ماہ شدت سے انتظار رہتا ہے۔ (محمد مبشر شاہ، کوہاٹ)

دسمبر کا شمار زبردست تھا۔ مجھے رسالہ پڑھتے ہوئے دو سال مکمل ہو گئے ہیں۔ اس رسالے کا میری تعلیم و تربیت میں بہت ہاتھ ہے۔ (عبداللہ بن نعیم، جہلم)

☆ ڈیر عبداللہ! ہمارا مقصد ہی وطن کے پیارے اور ہونہار بچوں کی اچھی تربیت کرنا ہے۔ دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کار خیر میں سرخرو اور کامیاب کرے۔ آمین

جنوری کے شمارے کا سرورق دل کو چھو لینے والا تھا۔ میں بہت عرصہ کے بعد تعلیم و تربیت میں خط لکھ رہا ہوں۔ میں سات سال سے تعلیم و تربیت کا قاری ہوں۔ یہ آج بھی اسی طرح تروتازہ ہے جیسے سات سال پہلے تھا۔

☆ مومنہ احسن! آپ ذہین اور مہنتی ہیں۔ ساری توجہ پڑھائی کی طرف مبذول کریں تاکہ ہماری ہونہار بچی مومنہ ملک و قوم کی خدمت کر سکے۔ اپنی خیریت سے آگاہ کرتی رہا کریں۔

میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ میرے لیے امتحان میں کامیابی کے لیے دعا کریں۔

نیا سال مبارک ہو۔ میں نے ساتویں جماعت میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ذائقہ کارنر بے حد پسند آیا۔ کچھ تحریریں بھیج رہی ہوں۔ (مریم سلیمان بٹ، گوجرانوالہ)

☆ اول آنے پر مبارک باد قبول کریں۔

میری طرف سے نئے سال کی مبارک باد قبول کریں۔ یہ رسالہ دو سال سے پڑھ رہا ہوں۔ اس کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ حفاظت، ترکیب، نیا سال اور سونے کا تاج بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ (بلال احمد، حسن ابدال)

میں یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس کر رہی ہوں کہ میں اپنی جماعت میں اول آئی ہوں۔ یہ سب میرے اساتذہ اور آپ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ جنوری کا شمارہ بہت اعلیٰ تھا۔ پانی پانی جسم اور ترکیب ٹاپ پر تھیں۔ (مریم سکندر، فضلہ سکندر، سرگودھا)

ڈیر آپ! پختہ یقین ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ اس ماہ کا میگزین تمام تر رعنائیاں لیے ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ تمام کہانیاں بہت پسند آئیں، خاص طور پر ”نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش طبعی“، ”شیخو بابا“ اور ”ترکیب“ کہانیاں بہت ہی پسند آئیں۔ ”حفاظت“ بھی اچھی کہانی تھی۔ آپ! اب کوئی اچھا سا اور دلچسپ ناول شروع کریں۔ آپ! میں نے چھوٹا سا خط لکھا ہے ضرور شائع کیجئے گا، ورنہ..... میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ آپ! ہمارا رزلٹ آگیا ہے، میں نے اس بار 2nd پوزیشن لی ہے۔ اس بار میری میتھ کی تیاری نہیں تھی، ورنہ میں نے پہلی پوزیشن لینی تھی۔ آپ! پچھلے مہینے میں نے خط بھی بھیجا تھا اور تمام سلسلوں میں حصہ بھی لیا تھا لیکن کچھ نہیں شائع ہوا۔ اب اجازت چاہتی ہوں اس تاکید کے ساتھ کہ میرا خط ضرور شائع کیجئے گا۔

(منیبہ عارف، ڈبکوٹ)

میں ابھی چھوٹی ہوں اور رسالہ پڑھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ آپ

کی بھیجی ہوئی کھانوں کی ترکیبوں سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گی۔ ان شاء اللہ۔ (فاطمہ صدیقی، کندیال)

جنوری کا شمارہ لاجواب تھا۔ نیلی روشنی کا راز، نیا سال اور سونے کا تاج پسند آئیں۔ (شہزاد حیدر شیخ، لاہور)

میں دو سال سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں لیکن خط پہلی بار لکھ رہی ہوں۔ جنوری کا شمارہ سپر ہٹ تھا۔ اتنا خوب صورت سرورق دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ اس میں بیت بازی کا ایک صفحہ بھی دیجئے۔

(مریم رضوان، راول پنڈی)

میں نے اپنے قریبی اسٹور سے تعلیم و تربیت خریدا اور پڑھا۔ بہت اچھا لگا۔ میرا خط ضرور شائع کیجئے گا۔

(عدنان سجاد، جھنگ صدر)

میں گزشتہ سات ماہ سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ یہ مجھے بہت پسند ہے۔ ساری کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ (اسد اللہ سعد، خواص پور)

جنوری کا شمارہ بہت پسند آیا۔ سرورق نے تو چار چاند لگا دیئے۔ میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ میں 2012ء سے اس کی مسلسل قاری ہوں۔ (فاطمہ الزہرہ، ذریہ اسماعیل خان)

آفتاب عدیل، عباس، افراح اکبر، سارا اکبر، محمد اجمل شاہین، محمد رمیز بٹ، ذونیرہ جاوید، عثمان وجیہہ احمد، ردا عدیل، محمد نعیم امن، مریم جاوید، نادیہ ممتاز، ماریہ عبدالحمید، محمد شاہد، لاہور۔ حسنین شفیق، ٹیکسلا، ملک مبشر جوشی روڈ۔ سلطان، رشیدہ عدنان، کراچی۔ محمد عبداللہ راشد نظام، کوٹ مومن۔ عائشہ کریم، ملتان۔ ذیشان احمد، کندیال۔ محمد حمزہ، عتیقہ ارشد، مریم صدیقہ، کرن فاروق، اسامہ بن طاہر، منڈی بہاؤ الدین، محمد زین عظمت، گوجرانوالہ۔ حسین انصر مان، قلعہ دیدار سنگھ۔ کشف جاوید، فیصل آباد۔ زینب کامران قریشی، سرگودھا۔ محمد عثمان علی، جھنگ۔ عشاء سعید، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ راجہ ثاقب محمود، پنڈ دادن خان۔ عزیز احمد، شیدو، نوشہرہ۔ عالیہ اقبال، محمد شہروز، وزیر آباد۔ صباحت تنویر، پشاور۔ صبیح الحسن، سیال کوٹ۔ آمنہ علی، عاصم محمود، اسلام آباد۔ محمد عرفان اقبال، دنیا پور۔ محمد عمار، کراچی۔ محمد ذکوان، چشمہ۔

☆.....☆.....☆



نیم حکیم

اس لیے اب اس میدان میں بھی ان کا ہاتھ صاف ہو گیا تھا۔ نسخے بھی مالک اور جانور کے ملتے جلتے ہوتے تھے، صرف حسب ضرورت مقدار بڑھادی جاتی تھی۔

اسی نیم کے نیچے ان کے دادا مرحوم نے ان کی پیدائش کے وقت کانوں میں اذان دی تھی، اسی کی چھاؤں میں ان کا سنہرا بچپن اور نوجوانی گزری۔ نیم کی کس شاخ پر کون کون سے پرندوں کے گھونسلے تھے اور کس پرندے نے کب انڈے دیئے، حکیم صاحب باخبر رہتے تھے۔

نزلہ، زکام، سے ٹی بی تک کا علاج حکیم صاحب نیم کے درخت سے کشید کی گئی دواؤں سے ہی کرتے تھے۔ شربت نیم، عرق نمکول، سفوف نیم، نیم کے گوند کا خمیر، نیم کی چھال کا مرہم، غرض کہ کوئی ایسی دوا نہ تھی جس میں نیم کے اجزاء شامل نہ ہوں۔ جنوبی دیوار کے نیچے دھوئیں سے کالے کنستر میں ہر وقت نیم کے پتے ابلتے رہتے تھے جو مولیشیوں اور ان کے مالکوں کے رستے زخموں کے لیے اینٹی سپٹک کے طور پر استعمال کیے جاتے۔ موتی جھالا کا تو واحد اور کارگر علاج یہی تھا کہ مریض کے ہاتھ میں نیم کی شاخ تھما دی جاتی اور روز صبح نیم گرم پانی میں نیم کی پتیوں کو ڈال کر

یوں تو وہ محاورے والے ”نیم حکیم خطرہ جاں“ کی تعریف پر بھی پورے اترتے تھے لیکن ان کی وجہ شہرت یہ نہیں تھی۔ ان کے والد مرحوم نیم والے حکیم کے نام سے مشہور تھے۔ ہمارے حکیم صاحب شروع شروع میں نیم والے حکیم سے ہی مشہور رہے، پھر لوگوں نے پیار اور عقیدت سے نیم حکیم کہنا شروع کر دیا۔ ان کی رہائش گاہ اور مطب کے سامنے ایک صدی پرانا نیم کا درخت ان کی شخصیت اور پیشے میں اس طرح گھل مل گیا تھا کہ وہ ان کی شناخت بن گیا تھا۔ نیم کا یہ درخت ان کی رہائش گاہ اور مطب کے سامنے شامیانے کی طرح تنا ہوا تھا۔ حکیم صاحب کا زیادہ وقت نیم کے نیچے پڑے کشادہ تخت پر ہی گزرتا کیوں کہ تحصیل حسن پور کے علاوہ دور دور تک کوئی اسپتال یا ڈاکٹر نہیں تھا اس لئے نا صرف ہمارے گاؤں شیر پور بلکہ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی حکیم صاحب کے چرچے تھے۔

حکمت، ایلو پیٹھی، ہومیو پیٹھی، جراحی کے علاوہ حکیم صاحب کا روحانیت میں بھی دخل تھا اور مریض کی آخری سانس تک وہ اپنے سارے تجربے آزماتے رہتے۔ اکثر مریض خرچہ بچانے کے لیے اپنے جانور بھی حکیم صاحب کے علاج کے لئے لاتے رہتے تھے،

نہانے کی ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا تھا۔ بچے نیم کی شاخ لے کر بہت خوش ہوتے اور اس سے دن بھر پتنگیں بھی لوٹتے رہتے۔ حالاں کہ حکیم صاحب کا لہجہ نیم کی طرح ہی کڑوا تھا پھر بھی عقیدت مندوں کی بھیڑ لگی رہتی اور مریض (انسان اور مویشی) نیم کے سائے میں پڑی بوسیدہ دری پر لیٹے، بیٹھے، لوٹتے نظر آتے۔ تخت کے ایک کونے میں آنکھ، کان، ناک، حلق کا شعبہ تھا اور دوسرے کونے میں ڈینٹل کلینک تھا جہاں ایک ٹین کے ڈبے میں نیم کی چھال کی راکھ ایک بوتل میں نیم گرم پانی اور ایک زنگ آلود زنبور منہ کھولے پڑا رہتا۔

دانتوں کے چھوٹے موٹے امراض تو حکیم صاحب نیم کی مختلف نمبروں کی مسواکوں سے کرتے۔ مرض کی نوعیت کے اعتبار سے اسی نمبر کی مسواک تھما دی جاتی اور مریض اسے گنے کی طرح چوستا چلا جاتا۔ دانت کا درد ٹھیک ہونے پر یہ مسواک پا جامہ میں کمر بند ڈالنے کی سلائی یا بکری کے کھونٹے کے طور پر استعمال ہو جاتی۔ دانت کا مستند اور شرطیہ علاج وہ زنبور ہی سے کرتے تھے۔ نیم کے تنے کے گرد ایک موٹی رسی بندھی رہتی۔ دانت نکالنے کی مہم سے پہلے یہ رسی مریض کی گدھی سے ہوتی ہوئی دونوں بغلوں میں پھنسا دی جاتی اور یوں اس شکنجہ میں پھنسا مریض پوری کارروائی کے دوران پھڑپھڑاتا رہتا۔ اب حکیم صاحب نے ایک پیر نیم کے تنے پر رکھا اور زنبور سے دانت کو گرفت میں لیا۔

تھوڑی دیر رستہ کشی رہی اور آخر دانت باہر آ گیا۔ شکنجے سے آزاد ہوتے ہی مریض کے منہ سے مغلظات اور خون کا فوارہ نکل پڑا۔ جب راکھ اور نیم گرم پانی سے کچھ سکون ملا تو مریض نے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”اجی حکیم صاحب! یو کیا گجب (غضب) کر دیا۔ دانت تو یو والا نکالنا تھا تم نے برابر والا نکال دیا۔“

حکیم صاحب نے پیار سے مریض کو چپت مار کر کہا۔
”ارے مجھے پتا ہے۔ ابے کیا زنبور کے لیے جگہ بناؤں؟“
اتناس کر مریض چادر لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

ہر قسم کی خارش کا علاج حکیم صاحب نیم کی چھال کے ٹکڑے سے کھیرا کر کے کرتے۔ اس مقصد کے لیے نیم کے تنے میں پیوست کیلوں سے مختلف سائز کے کھیرے لٹکے رہتے۔ بڑے چھال کے

ٹکڑے بیلوں، بھینسوں، گھوڑوں کے لیے اور چھوٹے سائز کے ان جانوروں کے مالکان کے لیے استعمال ہوتے۔ کھیرے کے بعد مریض کھال چھلنے کی سوزش کی وجہ سے خارش کو بھول جاتا۔

اگر ایک بار کوئی مریض حکیم صاحب کے قبضے میں آ جاتا تو اس کا پیچھا قبر تک نہ ٹوٹتا بلکہ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ بہاری پور کے ڈھال پر جو کفن، عرق گلاب، کافور اور دیگر لوازمات کی میت کے لیے جو دکان ہے وہ بھی حکیم صاحب کی ملکیت ہے۔

آنکھوں کے ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی۔ ”کاجل نور چشم۔“ ایک مرتبان میں نیم کے پھول اور توڑے کی سیاہی سے یہ کاجل تیار کیا جاتا جس کی ایک خوراک حکیم صاحب خود اپنے دست شفقت سے دیتے یعنی اپنی شہادت کی انگلی کے پورے پر کاجل لے کر مریض کی آنکھ میں پھیر دیتے۔ کچھ دیر تک تو اس کو دن میں تارے نظر آتے پھر وہ باقی خوراک لے کر ٹوٹتا ہوا رخصت ہوتا۔ کاجل لگنے کے بعد اس کی اور اس کے بیل کی آنکھیں ایک جیسی لگتیں۔

ہر مرض کے نسخے میں یہ اجزاء اور ہدایات ضرور شامل ہوتیں۔

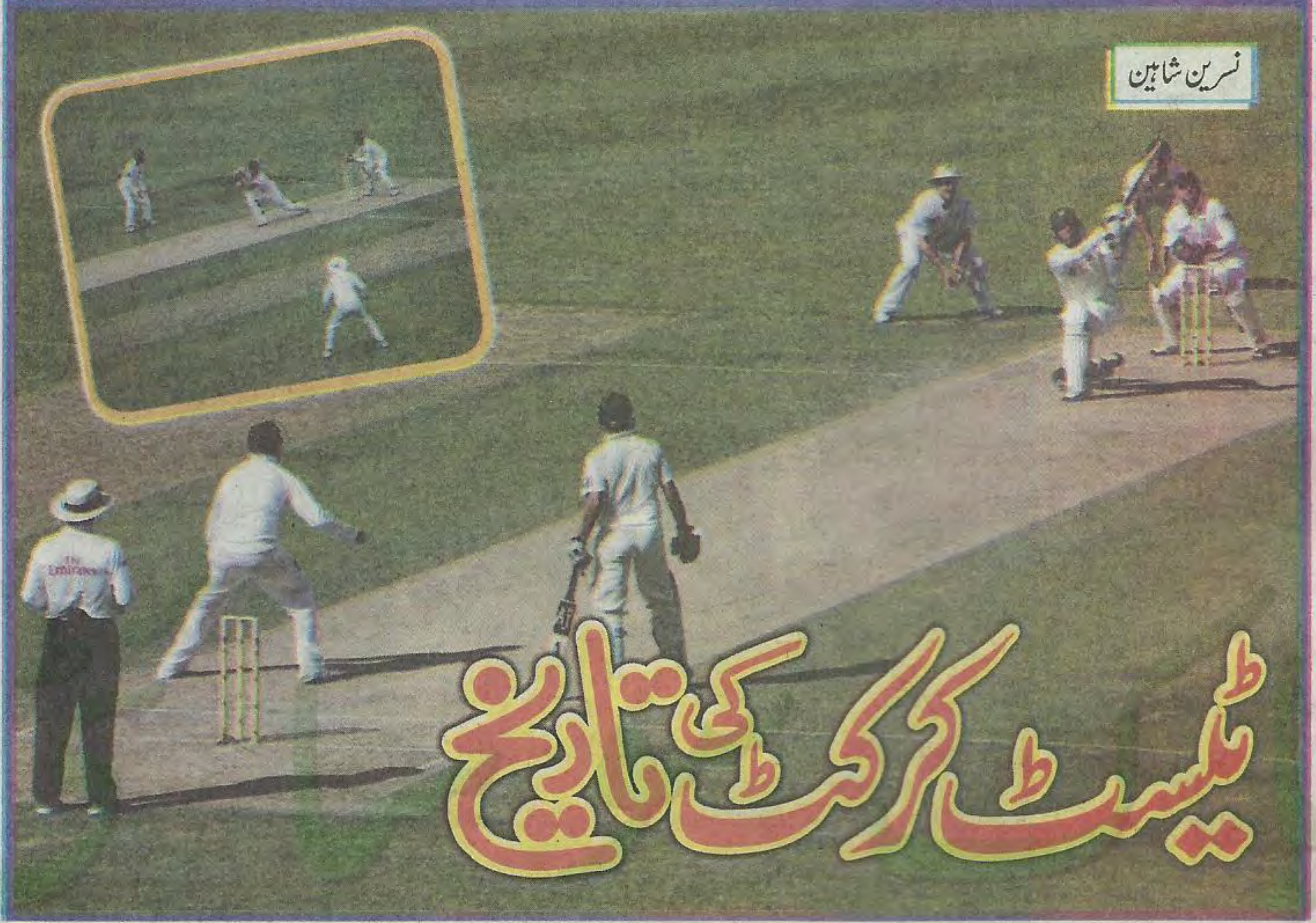
روز صبح نیم کی پتیوں کو اُبال کر نیم گرم پانی میں ملا کر غسل صبح، دوپہر، شام تین تین قطرے عرق نیم، بلاناغہ نیم کی مسواک کا استعمال، سونے سے پہلے نمکولیوں کے سفوف کی دو چٹکیاں۔

☆☆☆

کھیرا (Cucumber)

ایک بیل کا پھل جو بطور سلا د استعمال ہوتا ہے۔ ایک بالشت لمبا ہوتا ہے۔ رنگ سبز اور سفیدی مائل لکڑیوں جیسا ہوتا ہے۔ مزاج میں سرد ہے۔ یہ زمانہ قدیم سے کاشت کیا جا رہا ہے۔ پاکستان، بھارت، امریکہ، ایران اور دیگر ممالک میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ اس کے بے شمار فوائد ہیں۔ مثلاً یہ مٹانے کی گرمی، جلن، درد اور پیشاب رک رک کر آنا، معدے کی سوزش، ریقان میں جسم کو سکون اور آرام پہنچانے، سرد درد اور بخار کو دور کرنے کے لیے نافع ہے۔ آنکھوں پر سوزش کی صورت میں اس کے چھلکے کو آنکھ پر تھوڑا سا رکھیں، فائدہ ہوگا۔ اسے کھانے کے بعد دو تین گھنٹے تک پانی نہیں پینا چاہیے کیوں کہ ہیضہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس کا سائنسی نام Cucumis Sativa ہے۔

نسرین شاہین



ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ

کرکٹ شروع ہی سے بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول رہا ہے۔ سب سے اعلیٰ درجے کی کرکٹ، ٹیسٹ کرکٹ ہے۔ کرکٹ کے قوانین کافی پیچیدہ ہیں جب کہ بین الاقوامی کرکٹ کے لیے معیاری گراؤنڈ اور وکٹ سے لے کر قیمتی اور معیاری سامان بھی درکار ہوتا ہے۔ اسی لیے پہلے ٹیسٹ میچ کے بعد سے 138 سال کی مدت میں صرف 10 ممالک ٹیسٹ کھیلنے کے اہل قرار پائے ہیں۔ کرکٹ کی ورلڈ گورننگ باڈی کا نام انٹرنیشنل کرکٹ کونسل (آئی سی سی) ہے، جس کی جانب سے کھیل کی ترقی اور فروغ کے لیے کئے جانے والے اقدامات کے نتیجے میں اب یہ کھیل چین سے لے کر امریکہ اور افریقہ تک پھیل گیا ہے اور آئی سی سی کے رکن ممالک کی تعداد 80 سے بڑھ گئی ہے۔

کرکٹ کے قواعد، سامان اور طریقہ دنیا بھر میں طے شدہ معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ تاہم میدان کا کوئی سائز مقرر نہیں ہے۔ کھیل میں سب سے اہم سچ ہوتی ہے، جس پر کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ سچ کی لمبائی 22 گز اور چوڑائی 8 فٹ انچ ہوتی ہے، جس کے دونوں جانب تین تین وکٹیں نصب کی جاتی ہیں جن پر بیلز لگائی

کرکٹ کے کھیل کا آغاز انگلینڈ سے ہوا اور یہ پانچ سو سال سے انگلینڈ کا ایک مقبول کھیل ہے۔ اس کھیل کی ابتدا اسٹول بال سے ہوئی۔ ایک اسٹول رکھ کر کھلاڑی آنے والی گیند اپنے ہاتھ سے مارتا، بیٹسمین کو رن نہیں ملتے تھے ایک پوائنٹ ملتا تھا۔ گیند جب سیدھی اسٹول پر لگ جاتی تھی تو بیٹسمین آؤٹ ہو جاتا تھا۔ بعد میں یہی کھیل خالی ہاتھ کے بجائے بیٹسمین چھڑی سے کھیلتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ بیٹ نے جو مختلف شکلیں اختیار کیں، ان میں سے موجودہ بیٹ کی سب سے عمدہ شکل ہے۔

تاریخ کے اوراق کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ کرکٹ کے آغاز سے ڈیڑھ سو سال تک بولر کندھے کے نیچے سے گیند کرتا تھا۔ پھر کندھے کے اوپر سے گیند کرنے کا رواج اس طرح ہوا کہ ایک خاتون نے بہت گھیر والا اسکرٹ پہن رکھا تھا، جس کا پھیلاؤ بہت تھا۔ وہ خاتون اپنے بھائی کو گیند کر رہی تھی۔ وہ کندھے کے نیچے (Under Arm) سے گیند کرنے میں مشکل سے دوچار تھی۔ اس نے اس کا یہ حل نکالا کہ سر کے اوپر سے ہاتھ گھما کر گیند کی، پھر اس طرز پر سب گیند کرنے لگے یہ Over Arm کی دنیا ہے۔

کہ وہ گیند کو با آسانی انگلیوں یا کلائی کی مدد سے گھما کر بیشمین کو آؤٹ کرے۔ فیلڈنگ کرنے والا کپتان 80 اوورز کے بعد نئی گیند لے سکتا ہے۔ کرکٹ میں بیشمین کو آؤٹ کرنے کے کئی طریقے ہیں جن میں بولڈ، کیچ، اسٹمپ، رن آؤٹ، ہینڈل دی بال، ہٹ وکٹ، ہٹ دی بال ٹوائس اور آفسٹر کٹنگ دی فیلڈ شامل ہیں۔



کرکٹ دُنیا کا واحد کھیل

ہے جس میں ایک ایک میچ بہت زیادہ وقت لیتا ہے، ٹیسٹ میچ عام طور پر پانچ دن تک اور بعض مرتبہ چھ چھ دن تک جاری رہتے ہیں۔ اس کے باوجود بعض دفعہ نتیجہ نہیں نکل پاتا۔ ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز 19 مارچ 1877ء سے میلبورن کرکٹ گراؤنڈ میں ہوا۔ پہلا ٹیسٹ چار دن تک جاری رہا۔ درمیان میں ایک دن آرام کا تھا۔ آسٹریلیا نے پہلا ٹیسٹ جیت لیا تھا۔ اگر کرکٹ دو ملکوں کے درمیان کھیلی جاتی، تب اس کی ضرورت نہ تھی کہ عالمی چیمپئن شپ کرائی جائے مگر جب دو سے زائد ملکوں کے درمیان ٹیسٹ کرکٹ کھیلی جانے لگی تو کچھ لوگوں نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ دوسرے کھیلوں کی طرح کرکٹ کی بھی عالمی چیمپئن شپ منعقد کی جائے۔ مشکل وہی تھی کہ پانچ دن تک ایک ٹیسٹ جاری رہے گا اور فیصلہ نہ ہو سکا تو پھر ایک اور ٹیسٹ کرایا جائے۔ ایسی کسی چیمپئن شپ کے نتائج برآمد ہونے میں سال چھ ماہ لگ جائیں گے تو اس کا فائدہ کیا ہے۔ پھر بھی جنوبی افریقہ سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر نے ٹرانسکولر ٹیسٹ ٹورنامنٹ کرانے کا فیصلہ کیا۔

جاتی ہیں۔ کرکٹ بیٹ کی لمبائی 38 انچ اور چوڑائی سوا چار انچ ہوتی ہے۔ بیٹ کا بلیڈ (چوڑا حصہ) عموماً انگلش ولوکلٹری کا بنا ہوتا ہے جو کافی مضبوط اور پکدار ہوتی ہے جب کہ ہینڈل ساوک کین سے تیار کیا جاتا ہے۔ بلیڈ پر ہینڈل کا جوڑ وی V کی شکل کا ہوتا ہے جسے اسٹیل یا بربر اسپرنگ سے جوڑا جاتا ہے اور ہینڈل پر ربر بڑ چڑھایا جاتا ہے کہ بیشمین کو جھٹکا نہ لگے۔ کرکٹ گیند کا وزن ساڑھے آٹھ سے پونے نو اونس تک ہوتا ہے۔ گیند کے اندر کارک بھری ہوتی ہے جس کے گرد اون استعمال کی جاتی ہے جس پر دویا چار حصوں والا چمڑے کا خول لگایا جاتا ہے۔

کرکٹ کی ہر ٹیم گیارہ کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے، کھیل کا آغاز کپتانوں کے درمیان ٹاس سے ہوتا ہے۔ ٹاس جیتنے والے کپتان کو پہلے بیٹنگ یا فیلڈنگ کا حق حاصل ہوتا ہے۔ بولنگ کی ابتداء عموماً فاسٹ بولر کرتے ہیں کیونکہ وہ نئی گیند کی چمک سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور گیند کو ہوا میں یا پیچ سے باہر مود کر سکتے ہیں۔ جب گیند کی چمک ختم ہو جاتی ہے تو اسپنرز کے لیے موقع ہوتا ہے

کلام اقبال

اگر کج رو ہیں انجم، آسماں تیرا ہے یا میرا؟
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو، جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی
خطا کس کی ہے یارب! لامکاں تیرا ہے یا میرا؟
اسے صبحِ ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر؟
مجھے معلوم کیا! وہ راز داں تیرا ہے یا میرا؟
محمدؐ بھی ترا، جبریلؑ بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں تر جہاں تیرا ہے یا میرا؟
اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن
زوالِ آدمِ خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

ٹیسٹ کرکٹ کے بعد کاؤنٹی کرکٹ کے میچوں کی مقبولیت میں بھی کمی آنے لگی۔ پہلے تو کاؤنٹی کرکٹ کے ارباب انتظام اس فلسفے پر یقین کرتے رہے کہ کرکٹ کا اپنا منفرد انداز، رومانوی وابستگی، روایتی شان اس کھیل کو ختم نہیں ہونے دے گا لیکن جب روز بروز دلچسپی میں کمی آنے لگی تو انھیں فکر لاحق ہونے لگی اور نیا کچھ کرنے کی سوجھی۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے کئی کمیشن بٹھائے گئے۔ جیکسن کمیشن (1944ء) ایتھم کمیشن (1957ء) رائٹ کر کمیشن (1937ء) ایشین (1961ء)، ان تمام کمیشنوں نے کھیل کی ترقی اور مقبولیت کے لیے رپورٹیں مرتب کر ڈالیں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ دوسٹر شارز کو 1960ء میں دو ہزار پاؤنڈ کا نقصان ہوا۔ سمرسٹ اور نارٹھمپٹن کو ساڑھے سات ہزار پاؤنڈ کا خسارہ ہوا۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کاؤنٹی کرکٹ میں پہلی انگلش کو 85 اور تک محدود کر دیا جائے تاکہ میچوں کو نتیجہ خیز بنایا جاسکے لیکن اس اقدام نے بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ کرکٹ میگزین (دی کرکٹر انٹرنیشنل) نے لکھا کہ اگر کاؤنٹی کرکٹ کو بچانا ہے تو کوئی اہم فیصلہ کرنا ہوگا، کرکٹ کے روایتی انداز کو ترک کرنا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

سرایپ پبلی نے فیصلہ کیا کہ انگلینڈ، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا کی ٹیموں کے درمیان ٹورنامنٹ کرایا جائے۔ چنانچہ 1921ء میں ان تین ٹیموں کے درمیان میچ کرائے گئے۔ ان میچوں کو صرف تین دن میں فیصلہ کن بنانے پر زور دیا گیا، پھر بھی تین ٹیسٹ میچ کسی فیصلے کے بغیر ختم ہوئے۔ 27 مئی 1912ء سے 22 اگست 1912ء تک یہ ٹورنامنٹ جاری رہا، اس میں کل نو ٹیسٹ میچ کھیلے گئے۔ انگلینڈ نے 6 ٹیسٹ کھیلے، چار جیتے، دو بغیر کسی نتیجے کے ختم ہوئے۔ آسٹریلیا چھ ٹیسٹ میں ایک ہار، دو جیتا، تین ڈرا ہو گئے۔ جنوبی افریقہ پانچ ٹیسٹ ہار گیا، ایک ڈرا ہو گیا۔ فائنل میچ انگلینڈ اور آسٹریلیا کے درمیان اول میں 19 اگست 1912ء کو شروع ہوا۔ اس میچ کے لیے پہلی مرتبہ یہ طے کیا گیا کہ فیصلہ ہونے تک جاری رہے گا۔ گویا کرکٹ کی تاریخ کا یہ پہلا میچ تھا جس کے غیر معینہ مدت تک جاری رہنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا لیکن فیصلہ چار دن میں ہو گیا۔ انگلینڈ نے فائنل 244 رنز سے جیت لیا۔ ٹرانگلور ٹورنامنٹ کے میچوں میں مہمان خصوصی بننے والوں میں کنگ جارج پنجم بھی شامل تھے لیکن تماشاویوں نے کم دلچسپی لی۔ بہر حال کرکٹ کی تاریخ کا یہ پہلا انٹرنیشنل ٹورنامنٹ شمار کیا جاتا ہے، جس کا چیمپئن انگلینڈ بنا تھا۔

کرکٹ میں عالمی چیمپئن شپ ٹورنامنٹ کرانے کی ہمت پھر کسی نے نہیں کی۔ ٹیسٹ کرکٹ میں نئی ٹیمیں شامل ہو گئیں۔ جنوری 1930ء میں ویسٹ انڈیز اور نیوزی لینڈ کو ٹیسٹ ٹیم کا درجہ ملا۔ دو سال بعد 1932ء میں انڈیا کو بھی یہ اعزاز حاصل ہو گیا۔ دولت مشترکہ سے تعلق رکھنے والے ملکوں میں کرکٹ کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ 1952ء میں پاکستان کو بھی ٹیسٹ کھیلنے والے ملکوں میں شامل کر لیا گیا۔ کرکٹ دنیا کے بڑے حصے میں کھیلی جانے لگی تھی۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے کرکٹ زیادہ مقبول تھی اور برطانوی باشندوں کو اس سے زیادہ دلچسپی تھی لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد مصروفیات بڑھیں اور کرکٹ کی مقبولیت کم ہونے لگی۔ ایسے کھیل مقبول ہونے لگے جن میں کم وقت میں نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔



دوستی

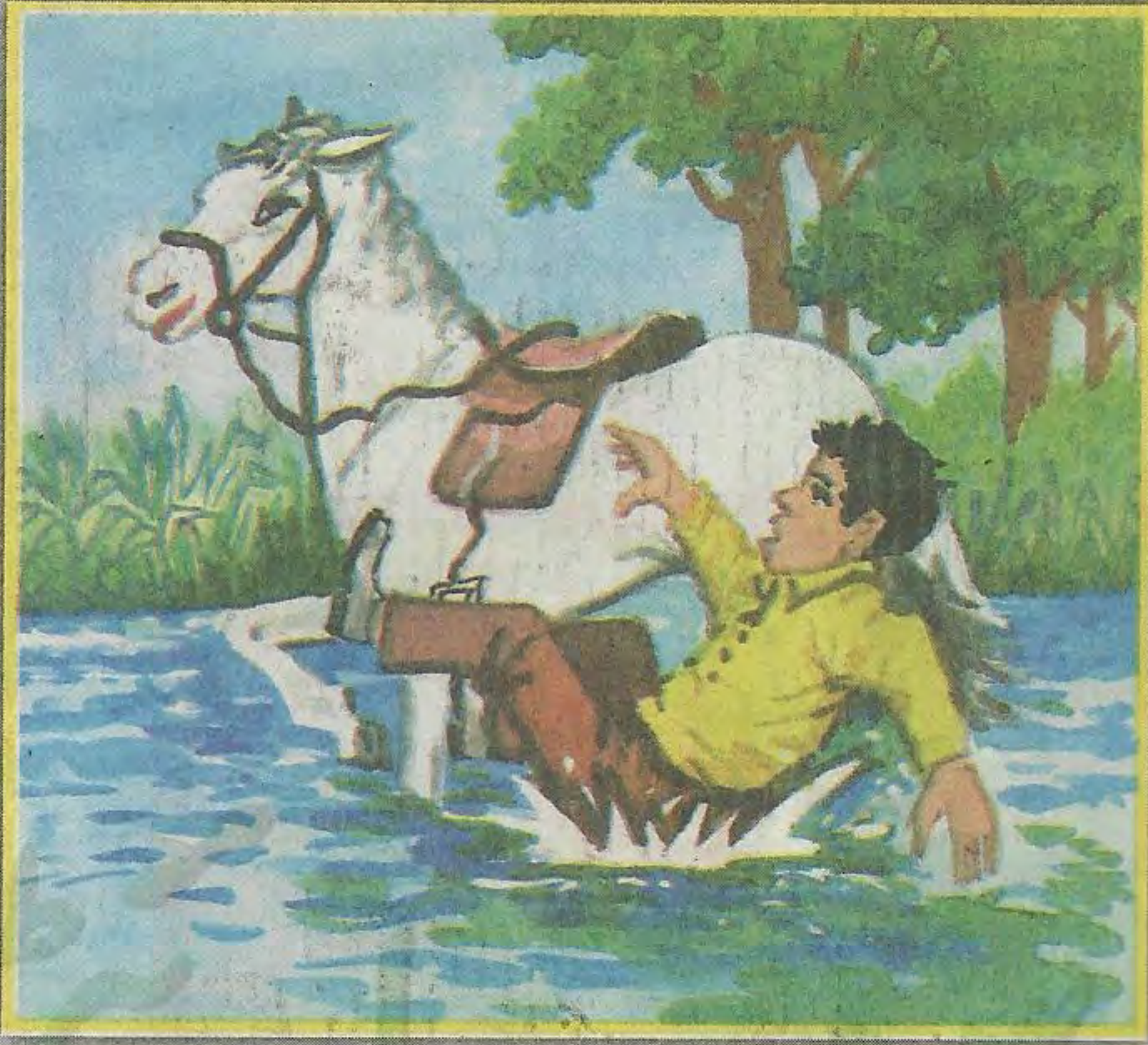
کوشش کرتا ہے۔ جگنو کو یہ بات کوئی اتنی بُری نہیں لگتی تھی مگر ہاشم کے ہاتھ میں ہر وقت چھڑی ہوتی تھی جو وہ ہمیشہ بیچارے گھوڑے کی ٹانگوں پر مارا کرتا تھا۔ معاذ کی کیا بات تھی۔ ہمیشہ ہمدردانہ رویہ رکھتا تھا اور کبھی کبھار کھانے کو گا جر اور مزے دار سیب دیتا تھا، کبھی کبھار کوئی میٹھی چیز بھی جو ہمیشہ اس نے میرے لیے ناشتہ سے بچائی ہوتی ہے۔ وہ میرے لیے جتنا کچھ کرتا ہے، کاش میں بھی اس کے کسی کام آسکوں، جگنو اکثر سوچتا۔

ایک دن معاذ حویلی کے گیٹ کے نزدیک جگنو سے باتیں کر رہا تھا۔ ہاشم ادھر سے گزرا۔ ”ہیلو معاذ کیا حال ہے؟ جیب میں کتنے پیسے ہیں؟ کھلونوں کی دکان پر میں نے آج نئی پستول دیکھی ہے۔“ ہاشم نے پوچھا۔ ”میرے پاس صرف پچیس روپے ہیں لیکن یہ روپے میں اس لیے جمع کر رہا ہوں تاکہ بھیا کی سالگرہ پر کوئی تحفہ دے سکوں۔“ معاذ نے جواب دیا۔ ”تو پھر ہفتہ بھر کے لیے مجھے ادھار دے دو تاکہ میں پستول خرید سکوں۔“ ہاشم مکاری سے مسکرایا۔

معاذ نے روپے دینے سے انکار کرتے ہوئے ہاشم کو یاد دلایا کہ پچھلے ہفتے جو تم نے روپے ادھار لیے تھے، وہ ابھی بھی تم نے واپس نہیں کیے۔ ”اچھا تو تم ہاشم کو انکار کر رہے ہو۔ تم جیسے کیڑے

شریف صاحب ریٹائرڈ فوجی افسر تھے۔ گاؤں میں ان کی بڑی سی حویلی تھی جہاں دوسرے جانوروں کے علاوہ انہوں نے ایک سفید رنگ کا بہت خوب صورت گھوڑا پال رکھا تھا۔ اس گھوڑے کا نام انہوں نے جگنو رکھا ہوا تھا کیوں کہ وہ اپنے سفید رنگ کی وجہ سے اندھیرے میں بھی بخوبی نظر آتا تھا۔ شریف صاحب کبھی کبھار جگنو کو تانگے میں جوت کر زمینوں پر لے جاتے ورنہ جگنو سارا دن حویلی میں مزے سے گھاس کھاتا۔ بارہ سالہ معاذ ہمیشہ اسکول آتے جاتے جگنو کے پاس رکتا۔ اس کی پشت پر پیار سے ہاتھ پھیرتا اور پوچھتا، پیارے جگنو کیسے ہو؟ آج مزے دار گھاس کھائی یا نہیں؟ میں تمہارے لیے اپنے سیبوں کے چھلکے اتار کر لایا ہوں جو میں نے آج اسکول کھائے تھے۔

جگنو کو معلوم تھا کہ معاذ آج تک اس کے لیے کچھ نہ کچھ لانے کو نہیں بھولا، اس لیے وہ معاذ کو بہت پسند کرتا تھا۔ جگنو سمجھتا تھا کہ آج تک وہ جتنے بھی لڑکوں سے ملا ہے۔ معاذ سب سے اچھا ہے، ورنہ دوسرے لڑکے کوئی زیادہ مہربانی نہیں دکھاتے تھے۔ مثلاً روہیم نے ایک دفعہ اس کو پتھر مارا تھا جب وہ گھاس چر رہا تھا۔ پھر سب سے بڑا اور خطرناک لڑکا ہاشم، ہمیشہ اسے پکڑ کر سواری کرنے کی



مکوڑے کی یہ جرأت۔“ وہ غصہ سے چلایا۔
اس سے پہلے کہ معاذ اپنے دفاع کے متعلق سوچے۔ ہاشم نے اسے نیچے گرا لیا اور زبردستی جیب سے روپے نکال لیے۔ معاذ روپوں کو زور سے واپس نہیں لے سکتا تھا کیوں کہ ہاشم اس سے کہیں بڑا تھا اور لڑاکا بھی۔ ہاشم تو بغلیں بجاتے ہوئے وہاں سے رن چکر ہو گیا اور بے چارہ معاذ بے چارگی سے اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔ جگنو نے سارا ماجرا اپنی بڑی بڑی اور حیرت زدہ آنکھوں سے دیکھا۔ معاذ پیچھے مڑا اور گھوڑے کے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے سہلایا۔ ”کتنا برا ہوا جگنو! میں اب یہ روپے واپس بھی نہیں لے سکتا۔ کتنی مشکل سے میں نے یہ روپے جمع کیے تھے۔“

جگنو بھی افسردہ ہو گیا۔ وہ بھی ہاشم سے اتنی ہی نفرت کرتا تھا جتنی معاذ۔ پھر اچانک جگنو کے جسم میں تھر تھراہٹ ہوئی اور اس نے ایک زقذ بھری اور حویلی کے گیٹ کو پار کر گیا۔ پھر حویلی کی دوسری طرف بنے ایک تنگ راستہ سے اپنے بھاری بھر کم جسم کو کسی طرح گزرا اور ہاشم کا انتظار کرنے لگا جو لمبے راستے سے آ رہا تھا۔ پھر وہ آ گیا۔ ہاشم ابھی تک سیٹی بجا رہا تھا۔ ہاشم جگنو کو دیکھ کر رک گیا۔ ”تم آخر حویلی کے پھانک سے باہر آ ہی گئے۔ چلو اب مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھا کر سیر کراؤ۔“ ہمیشہ ایسا ہوتا آیا تھا کہ ہاشم کو دیکھ کر جگنو بدک جاتا تھا مگر اب اس دفعہ وہ شرافت سے کھڑا رہا اور ہاشم اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی جگنو کی ٹانگوں پر رسید کی اور ششکارا۔

جگنو ہاشم کو لیے سڑک کی مخالف سمت کو مڑا۔ جہاں کبھی ایک تالاب ہوا کرتا تھا مگر آج کل پانی نہ ہونے کی وجہ سے صرف کیچڑ ہی کیچڑ تھا۔ وہ جب کیچڑ کے عین درمیان میں پہنچ گیا تو اس نے ایک جھرجھری لی اور ہاشم چاروں شانے چت کیچڑ میں جا پڑا اور کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ جگنو کسی فاتح کی طرح ہنہنایا۔ پھر اس نے اپنا بڑا سفید منہ نیچے جھکایا اور اپنے مضبوط دانتوں سے ہاشم کی بیلٹ کو پکڑا اور اسے اوپر اٹھا لیا۔ ہاشم کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ شاید گھوڑا اسے کھانے لگا ہے لیکن جگنو کے

ذہن میں اور ترکیب تھی۔ اس نے ڈرے سہمے ہاشم کو اسی طرح اٹھائے رکھا اور حویلی کے گیٹ کے پاس لے آیا جہاں معاذ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ معاذ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ہاشم بھیگے ہوئے چوہے کی طرح جگنو کے منہ میں لٹکا ہوا تھا اور اس بھیگی چھچھوند کو جو بھی دیکھتا اس کی ضرور ہنسی نکلتی۔ معاذ نے جگنو کے پاس جا کر اسے کہا کہ تم چاہتے ہو کہ میں اسی طرح ہاشم سے اپنے روپے واپس لوں جس طرح ہاشم نے مجھ سے لیے تھے اور میں کیوں نہ لوں، آخر میرے روپے ہیں۔ معاذ نے اپنے روپے ہاشم کی جیب سے نکال کر اپنی جیب میں ڈالے۔ پھر جگنو نے ہاشم کو زور سے زمین پر ٹیخ دیا اور معاذ کو آنکھوں آنکھوں میں بتایا کہ وہ اب حویلی کے اندر جانا چاہتا ہے، اس لیے گیٹ کھول دو۔

ہاشم چھوٹے ہی یوں بھاگا جیسے کمان سے تیر چھوٹا ہے۔ وہ خوف زدہ تھا کہ جگنو دوبارہ اس کے پیچھے آ کر اسے دبوچ نہ لے۔ ہاشم جیسے ہی اگلا موڑ کر اس کے غائب ہوا، معاذ نے بھی گویا سکھ کا سانس لیا۔ ”شکریہ جگنو! واقعی تم میرے اچھے دوست ہو۔ بھیا کو یقین نہیں آئے گا جب میں تمہارا کارنامہ انہیں سناؤں گا۔“ جگنو نے پیار سے اپنی تھوٹھی معاذ کے کندھے سے رگڑی تو معاذ کو سمجھ آ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ ”معاذ تم ہمیشہ میری مدد کرتے رہے ہو۔ آج ایک دفعہ میں نے تمہاری مدد کر دی تو کیا ہوا؟ اچھے دوست ہمیشہ ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔“ ☆☆☆

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتب لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 فروری 2014ء ہے۔

بلا عنوان



جنوری 2014ء کے ”بلا عنوان کارٹون“ کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔



- ▶ اماں، ابالیپ ٹاپ چلائیں، چھوٹا بھلو پرنٹ کرائیں۔ (انس امین، لاہور)
- ▶ ٹیکنالوجی کا سب کو چڑھا بخار، بچے بوڑھے سب ہیں اس کے شکار۔ (حسنہ امتیاز، راول پنڈی)
- ▶ اپنا اپنا کمپیوٹر، اپنا اپنا میل، اور بچہ کھیل رہا ہے عجب کھیل۔ (شرچیل انجم، کمالیہ)
- ▶ میں ہوں ٹیکنالوجی کی پیداوار، کیسا لگا آپ کو یہ شاہ کار۔ (ندا خان، پشاور)
- ▶ بھیجی تصویر گاؤں کی، مگر آئی ہے بچے کے پاؤں کی۔ (محمد اکرم صدیقی، میاں والی)



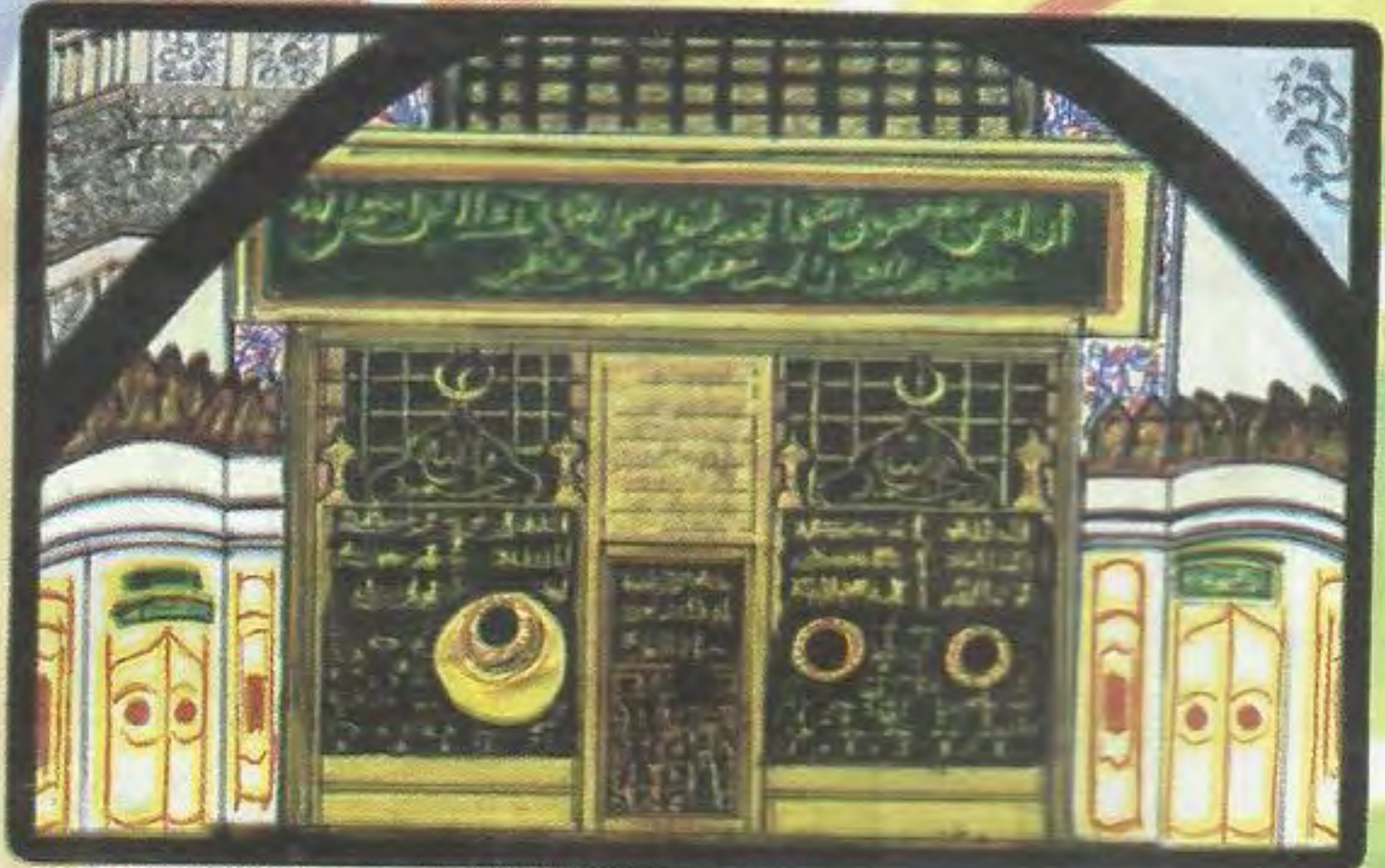
تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔

روضہ رسول

ہونہار مصور



نمرہ عبدالحق، انگ (دوسرا انعام: 150 روپے کی کتب)



ماہ نور ملک، گوجرانوالہ (پہلا انعام: 175 روپے کی کتب)



صغیر حسین شیخو، سرائے سندھو (چوتھا انعام: 100 روپے کی کتب)



محمد احسن علی، جکوال (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)



حبیب الرحمن، دہراؤ (چھٹا انعام: 75 روپے کی کتب)



عیاض افضل، گوجرانوالہ (پانچواں انعام: 90 روپے کی کتب)

گجراتی تصویریں کے نام: ذریعہ قرآن اندازی: سمیعہ رشید، لاہور۔ رحیم بیاض، گوجرانوالہ۔ حمزہ اگریم، دہراؤ۔ حرم الطافی، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ زبیر حمید، خانیوال۔
لانگہ ذوالقار، جھنگ۔ رانا علی حیدر، سرگودھا۔ آمنہ ظفر، لاہور۔ اسد اللہ سعید، گجرات۔ محمد شیراز، گوجرانوالہ۔ محمد دانیال شین، لاہور۔ شائلہ حماد، سرائے
سندھو۔ فاطمہ زہرا، شیخوپورہ۔ رومیہ نسیب، جہان۔ راول پٹوی۔ محمد احسن علی، جکوال۔ محمد عامر سلیم، ملتان۔ راجہ محمد عمیر، راول پٹوی۔ حریم سلیمان
بٹ، گوجرانوالہ۔ مونسہ احسن۔ رشفہ سنگھ، اسد صداقت، علی گل، گراجی۔ حریم جاوید، لاہور۔ انصافی شہزادی، عظمیٰ شہزادی، گجرات۔ غزہ حریم، انگ۔

ہدایات: تصویر 6 اچھی چوڑی، 9 اچھی لمبی اور گہرائی کے تصویر کی پشت پر مندرجہ بالا نام، عمر، کلاس اور
پورا پکا لکھنے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ ماسٹر سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 فروری
آخری تاریخ 8 مارچ

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

CPL NO. 123 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES

طلبہ و طالبات کے لیے فیروز سنز کی معیاری لغات



فیروز سنز پرائیویٹ لمیٹڈ
لاہور۔ راولپنڈی۔ کراچی



ہدایات برائے آرڈرز

پنجاب: 60۔ شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔ 042-111-626262

سندھ اور بلوچستان: پہلی منزل، مہران ہائیٹس، مین کلفٹن روڈ، کراچی۔ 021-35867239-35830467

خیبر پختونخواہ، اسلام آباد، آزاد کشمیر اور قبائلی علاقے: 277۔ پشاور روڈ، راولپنڈی۔ 051-5124970-5124879